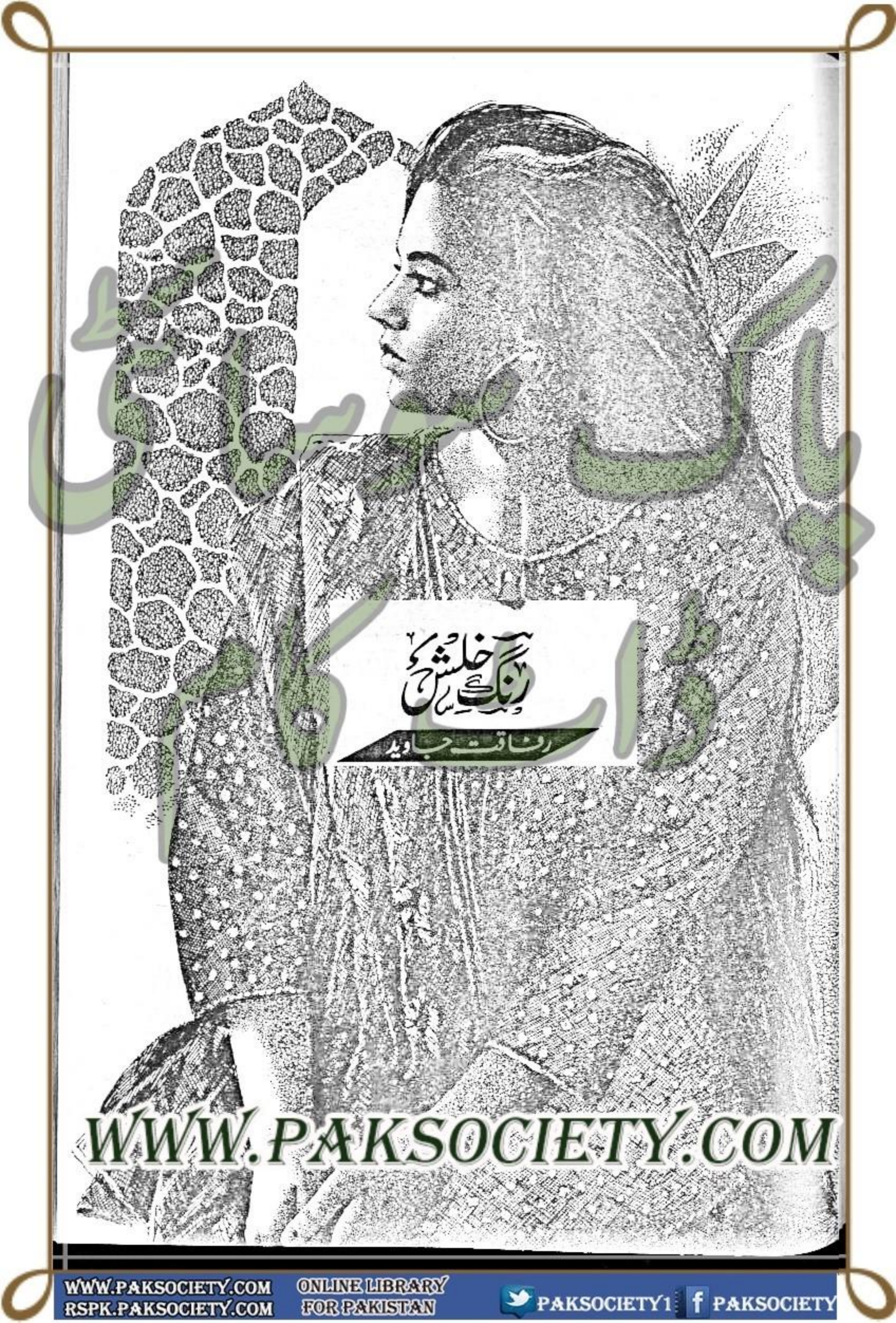
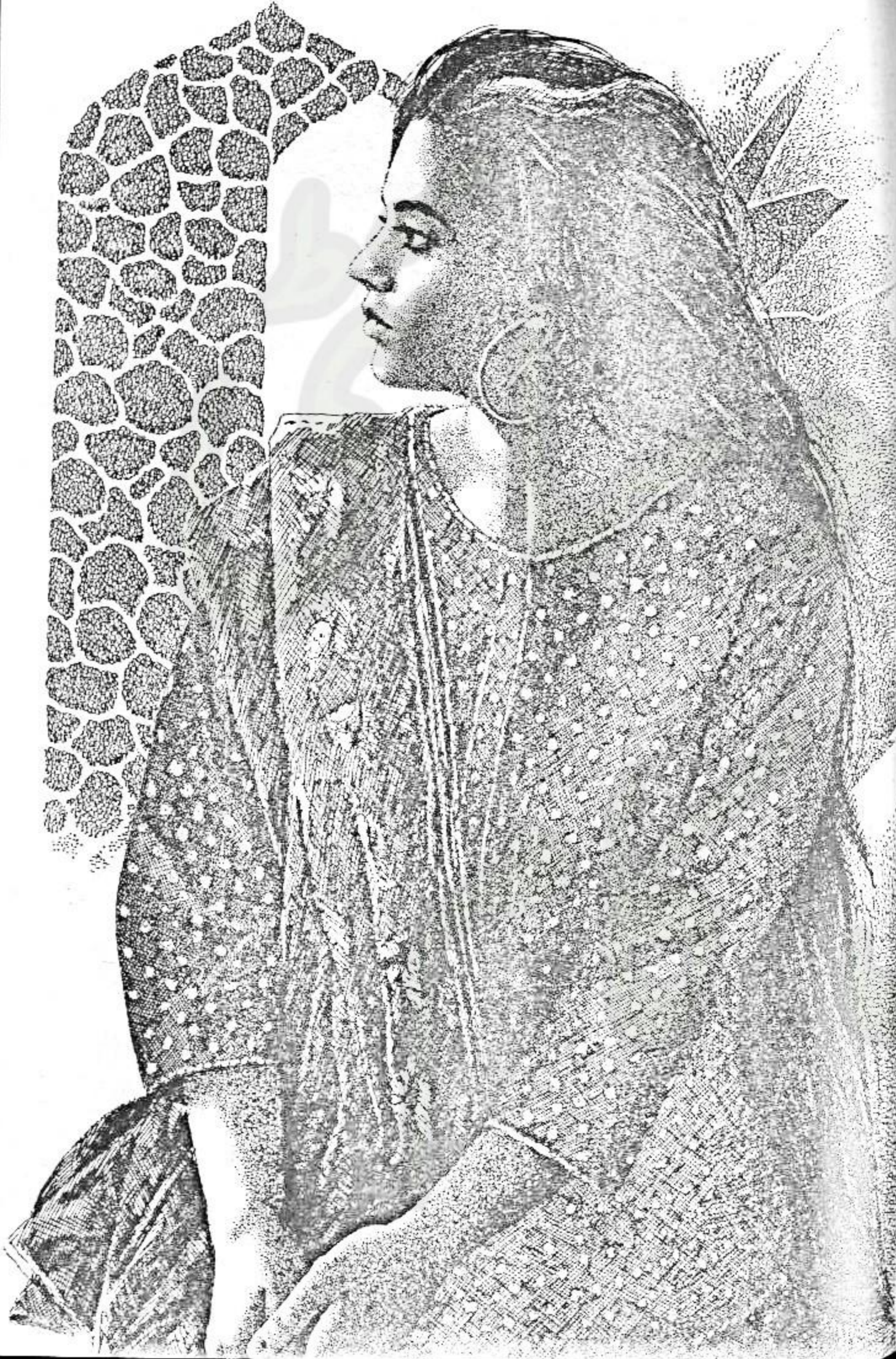




سنگِ خلیج

رفاقت جاوید

WWW.PAKSOCIETY.COM



رنگِ خلش

رفات جاوید

کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے حسین لمحے بھی خلش کی نذر ہو جاتے ہیں اور ہم جوں جوں اس احساس کو من کے اندر گہرائیوں میں دفن کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خلش کے بے حساب رنگوں کی پردہ کشائی ہمیں مضطرب کرنے لگتی ہے اور سکافاتِ عمل کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... گناہ جا بے جھوٹا ہوا بیڑا... سزا تو لازم و ملزوم ہے۔ اس کے باوجود امیر شجر سے گہرا ربط و تعلق رکھنا دوا بھی ہے اور عبادت و ریاضت بھی ہے، نشاط و صل بھی اور وجدان بھی ہے۔

ممکن ہے ایسا وقت ہو ترتیبِ وقت میں
دشک کو تیرا ہاتھ بڑھے میرا در نہ ہو

حسنا علی رضا فری پیریڈ میں اپنے آفس میں بیٹھے سوچے جارہے تھے کیونکہ آج اماں جان سزا آخری وارننگ جو دے ڈالی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی ہونے والی شریک حیات کے متعلق فیصلہ سنا دے تو اس میں انہی کی بہتری ہے۔ ورنہ وہ خود گھر سے نکل پڑیں گی یہ بینراٹھائے کہ ڈاکٹر حسنا علی رضا کے لیے ایک حد رشتے کی تلاش ہے۔ حاجت مند کی عمر ہے چالیس کے پیٹھے میں مگر بتاؤں گی میں پینتیس سال۔“ وہ ماں کی کئی ہوئی بات پر مسکرائے کہ یہ مائیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔“ ہاں تو اور کیا آخر کو میرے اس ہائی کوالیفائیڈ خوبرو جوان کا تعلق کھاتے پیتے ویل ایجوکیٹڈ گھرانے سے جو ہے۔“ ایف 6 میں مقیم یہ خاندان خالص پنڈی والی ترقی جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اسلام آباد شہر بنانے کا ارادہ کیا تو اسی امیدوار کے پردادانے جی 6 اور ایف 6 میں کوڑیوں کے عوض اپنے تمام بیٹوں کے لیے پلاس خرید کر نہایت دانش مندی اور دوراندیشی کا ایسا ثبوت دیا کہ اگلی نسل کے وارے نیارے ہو گئے۔ اور یہ صاحبزادے بھی انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھے۔ موصوف شادی تو ماں کی خوشی کی خاطر کرنا چاہ ہی رہے تھے مگر ابھی تک نظر انتخاب کسی پر ٹھہری نہیں تھی۔

”حسنا علی رضا اب تمہارا چھٹا کارا نہیں۔ ہوش میں آ جاؤ اور اپنی پسند کی لڑکی اپنے آس پاس ہی ڈھونڈ لو۔ ایمر جنسی ڈیکٹر ہو چکی ہے، عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اماں بھی خفا ہی سدھار جائیں گی اور مستقبل بھی تابناک نہیں رہے گا۔“ اپنے دل کی آواز پر وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائے۔ ”ماں جی سے کچھ بعید نہیں۔ مجھے کان سے پکڑ کر کہیں کہ بولواں جو بھی اور جیسی بھی ہے کی بنیاد پر قبول کر لو۔ میں تو مارا ہی جاؤں گا کیونکہ ماں کو انکار تو کر نہیں سکتا۔ اپنی ضد منوانے اور جنت گنوانے کا سودا مجھے منظور نہیں۔“ چہرے پر ہلکی سی تمسخرانہ مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ اسی اثنا آفس بوائے کافی کی پیالی ٹیبل پر رکھ کر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ جب سے انہوں نے اس یونیورسٹی کو جوائن کیا تھا۔ چہرے پر کبھی مسکراہٹ تو کیا اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت کتابوں اور کمپیوٹر میں ہی گم پایا تھا۔ ان کا خیر ہی رعب و دبدبے سے جو اٹھایا گیا تھا۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔

”آج ضرور کوئی خاص بات ہے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا ہل نکل گیا۔ حسنا نے کافی کی پیالی اٹھائی اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر لان میں بیٹھوں اور گھاس پر بیٹھے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کافی کا سپ لیا۔ سائرہ بانو انہی کی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ چند کولیکز کے ساتھ گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی اسکرین ٹیبل کھیل رہی تھی۔ باتونی ہونے کی وجہ سے اب بھی اس کی زبان چل رہی تھی۔

”چراغ تلے اندھیرا.....“ وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بڑبڑائے اور وہیں کھڑے کافی پینے لگے۔ آج کافی کی کڑواہٹ میں شہد کی گھلاوٹ تھی اور دل و دماغ مسرت و انبساط میں جھوم اٹھا تھا۔

”اب اماں جان کو خوشخبری سنا کر قدرے دھیمہ کرنے میں کامیاب ہونے کے امکان روشن ہو چکے ہیں لیکن اماں اور خاندان بھر کو یہ سن کر حیرت ضرور ہوگی کہ جس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا..... اب اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟ اپنی پسند کہاں سے اور کیسے ڈھونڈ لی؟ کون یقین کرے گا، سب مذاق سمجھ کر ٹال دیں گے۔“ وہ سوچتے ہوئے واپس آ کر اپنی چیئر پر بیٹھ کر ٹیک لگائے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ ”میرا فیصلہ جلد بازی میں غلط تو نہیں۔“ اب چہرے پر فکر مندی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ پھر اٹھے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر سائرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی دیگر اسٹوڈنٹس حمیرا اور آمنہ کا جائزہ لینے لگے۔ تھوڑے توقف کے بعد قلب و ذہن نے سائرہ بانو کے لیے پسندیدگی کا الارم دے دیا تو پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر

آئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ہاتھوں میں لرزش آ گئی۔

”ماں کی گاڑی، سوڈا میٹکٹ..... جناب والا ذرا اور گہرائی میں سوچ لو، کہیں عمر بھر کے لیے قیدی بن کر اپنی اس آزادی کو کھو نہ دینا۔ آزادی اس اسیری سے ہزار ہا درجے بہتر ہے۔ چاہے اس میں تنہائی ہی کیوں نہ ہو! اس کا اپنا ہی ایک حسین روپ ہے۔“ وہ واپس کرسی پر بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سائرہ بانو کے بارے میں سوچنے لگے۔ اگلے دن پھر وہ دیر تک کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے اور سوچتے رہے۔ جونہی فیصلہ کرتے اگلے لمحے بدک جاتے۔ وجہ عمر میں تفاوت تو ہرگز نہیں تھی بلکہ اپنی آزادی پر کمپروماز کرنا گوارا نہیں تھا۔

آج پھر عالم تذبذب میں گلاس ونڈو کا بلائینڈ سر کا کر باہر فکر مندانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ یونیورسٹی کے لان میں گھاس پر لڑکیوں اور لڑکوں کا وہی گروپ۔ اسکرین ٹیبل کھیلنے میں مصروف تھا۔ ہر لفظ کے بعد فضا میں ان کی نعرے باری سے جلتی رنگ بکھر جاتا تھا۔ اور پھر اگلا ورڈ بنانے کی کاوش میں خاموشی چھا جاتی۔ گیم کے آخر میں حسب معمول سائرہ بانو نے اپنی جیت کا اعلان کیا۔

”آئی ایم دی ونر..... سائرہ یو آر ٹو مج..... تمہارا تو جواب نہیں۔“ اس نے اپنے آپ کو سراہتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ ”او کے گاؤز اس ٹائم ٹو لیو فار کلاس۔“ وہ اپنی رسٹ وائچ... پر نظر ڈالتے ہی کھڑی ہو گئی۔

اور وہ سب بھی سرعت سے کلاس روم کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے آفس کے پاس سے گزرتے ہوئے سائرہ نے محسوس کیا کہ سر حسنا کھڑکی میں خاموشی سے کھڑے ان کی تمام ایکٹیوٹیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ سر تا پا ان کے رعب اور جلال کے خوف سے لرز گئی..... اور قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ سخت مزاج، کم گو اور تنک جڑھے مشہور ہونے کی وجہ سے سب کے لیے کسی اذیت ناک امتحان سے کم نہیں تھے۔ بزنس مینجمنٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری NYU سے حاصل کرنے کے بعد انگلش لٹریچر میں بھی واشنگٹن یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی..... پھر غالب، دانش، فیض، اقبال اور اردو کے مایہ ناز ادا با اور شعرا نے ایسا متاثر کیا کہ اردو لٹریچر میں بھی ڈگری لے بیٹھے۔

انہیں پانچ زبانوں پر ایسا عبور حاصل تھا جیسے پیدائشی اور رہائشی ہی وہاں کے ہوں۔ حُب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی قوم کے بچوں کو تعلیم دینے کی غرض اور جدید طریقوں سے روشناس کرانے کی چاہ میں پاکستان آ کر مقامی یونیورسٹی جوائن کر لی۔ لیکن بد قسمتی سے انہوں نے چند ماہ میں اس حقیقت کو پالیا تھا کہ اس ماحول کے ٹیم ورک میں ان کی شنوائی ہونے والی نہیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہونے کے باوجود۔ انہیں وائس چانسلر نے انقلابی ہونے کا خطاب دے کر ایک سائنڈ پر کر ڈالا تھا۔ اس لیے وہ اس یونیورسٹی کی پالیسی بدلنے میں تو ناکام رہے لیکن انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنے اسٹوڈنٹس کی طرف مبذول کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے رزلٹ خاصے تسلی بخش ہو چکے تھے۔ چونکہ سائرہ بانو ذہانت و فطانت کے لحاظ سے ان کی ٹکری تھی۔ ان سے کسی بھی موضوع پر ڈسکشن کرتے ہوئے خوف زدہ نہ ہوتی۔ جیسی وہ ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹ بن چکی تھی۔ اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک ان گنت ٹرافیز، سرٹیفکیٹس اور شیلڈز نے نہ صرف سائرہ بانو کی عزت و تحریم میں اضافہ کیا تھا بلکہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کی بھی اچھی خاصی عزت افزائی ہوئی تھی۔

اپنی بے لوث محنت سے اپنا لوہا منوانے کے بعد حسنا علی نے اس یونیورسٹی میں اپنا مقام اپنی پسند کے مطابق حاصل کر لیا تھا۔

جب ماں نے انہیں شادی کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا تو ان کے قیمتی لمحات سوچ و بچار میں گزرنے

رنگ خلش

کی راہنمائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے وہ اور کچھ نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی مزاجاً بھی زمین... آسمان کا فرق تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آسمان پر ان کا جوڑا بنا ڈالا تھا۔ اب وہ یونیورسٹی سے بھی فارغ ہو گئی تھی۔ والدین کا آگے پڑھانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے آنکھوں پر ایمان کی پٹی باندھ کر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ اپنے رب کے فیصلے پر راضی بہ رضا ہو کر سب نے خوشی، خوشی اس رشتے کو آئیڈیل سمجھ کر دعائے خیر پڑھی اور ایک مہینے کے بعد سائز بانڈ نے حسنت علی کی خاموش، تنہا اور ہر جذبے سے عاری زندگی میں پلچل بچادی۔ شروع کے چند دن بچے کے شوق کے مانند گزر گئے جو نیا کھلونا پا کر وقتی طور پر بے پناہ خوش ہوتا ہے کہ ایک دم حسنت کو محسوس ہوا کہ ان کی ذاتی زندگی کے ہر لمحے پر سائزہ قابض ہو چکی ہے ان کی آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی... پابندیوں کی زد میں جا چھپی ہے۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا۔ سائزہ کا اس وقت مزید کچھ بھی پڑھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ فی الحال وہ اپنی زندگی کو پڑھائی سے نہیں بلکہ فراغت سے انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

”آپ نے ہنی مون کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ سائزہ ان کی اسٹڈی میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر کچھ جھجکتے ہوئی بولی مگر انہوں نے کمپیوٹر سے نظریں ہی نہ اٹھائیں۔

”حسنت میں آپ سے بات کر رہی ہوں، شادی ہوئے دو ہفتے ہو گئے ہیں، آپ نے تمام چھٹیاں اسی اسٹڈی کی نذر کر دیں۔ کیا یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی پروگرام نہیں؟“ وہ پھر متذبذب لہجے میں بولی۔ ”کیا چند دنوں میں ہی شادی کا نشہ اتر گیا ہے حسنت...؟“ یڈشہ ابدی نہ ہو تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی انیسیت و لگاؤ کا ہے نہ کہ غیریت کا۔“

”ہاں یہ تو ہے مگر اب ہمیں واپس اپنی روٹین پر آ جانا چاہیے۔ یا محبت کے سوا اور بھی تو بہت سے جھمیلیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ انہیں بھی تو ساتھ لے کر چلنا ہے۔“ وہ کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی رکھائی سے بولے تو سائزہ ایک دم سے ہراساں و پریشان انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا شادی اسے کہتے ہیں... بورائنڈ سو پورڈ۔“ وہ بڑبڑائی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کہا، تمہاری ادھوری تعلیم تمہاری توجہ کی منتظر ہے، شادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تعلیم کو مکمل کیے بغیر ہی خیر باد کہہ دو۔ شادی دو باہوش انسانوں کے مل جل کر رہنے کا نام ہے، بہت عام اور نازک سا رشتہ ہے یہ... اگر ایسا نہ ہوتا تو پل بھر میں ٹوٹ نہ جاتا۔ اس لیے بہتر ہے... ہم دونوں کے لیے کہہ دوں کہ آزادی برقرار رہے۔ اس میں گھبرانا اور انجوائے منٹ اپنی، اپنی آزادی میں ہی ہے۔“ وہ نرم لہجے میں بولے۔

”دیکھو میں تمہاری زندگی کو پابند نہیں کروں گا۔ تم میرے کام اور مشغلوں میں دخل اندازی نہیں کرو گی۔“ سائزہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ سنجیدگی سے ڈاکومنٹری کی طرف متوجہ ہو گئے... سائزہ کے جذبات کی پروا کیے بغیر ان کے چہرے پر بے انتہا سکون تھا جیسے ان کی باتوں میں بھرپور چاشنی ہو... سائزہ کے اعصاب مشتعل سے ہو کر رہ گئے۔

”حسنت کمپیوٹر آف کر کے میری بات پر توجہ تو دیں۔ کل ہی آپ کی بڑی بھابی بتا رہی تھیں کہ وہ شادی کے چوتھے دن ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔“ وہ اب تھوڑا رقت آمیزی سے بولی تھی۔

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ بجھل بھابی نے کیا رپورٹ دی اور چھوٹی بھابی اور میری بہنوں نے کیا پٹی پڑھائی ہے؟“

ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2014ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



رنگ خلش

یہ سوچ کر اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگی اگر یہ مزاج تھا ایسے ارادے تھے، ایسی ظالمانہ سوچ تھی، ایسا سچ بستہ روئیہ روار کھنا تھا تو بھلا شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ میرا سائبان جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ کیسا مضبوط اور پختہ تھا۔ آپ نے میرے اس انوٹ سہارے کی بنیادیں ہلا دیں۔ اب مجھے وہاں کون خوشی سے واپس ویکم کہنے کے لیے تیار ہوگا۔ اب کوئی نہیں پہچانے گا اور نہ ہی ہمدردی کے دوبول سے مجھے طمانیت بخشنے گا۔ بس اب یہی میرا ٹھکانا ہے، جہاں دلہن بن کر آئی تھی یہاں سے کفن کی پردہ داری میں لہر میں اتاری جاؤں گی۔ وہ خود کلامی کرتی رہی۔ آنسو تکیہ بھگونے میں پیش، پیش تھے۔ حسنا نے کمرے میں جھانکنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کمرے میں شام اتر آئی تھی جو آہستہ، آہستہ سرمی ہوتی تاریکی کا روپ دھارتی چلی گئی اور وہ اسی کیفیت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی قسمت کی لکھت کو بدلنے کا سوچتی چلی گئی مگر کوئی راہ بھائی نہ دی تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگی ابھی نئی بات ہے، نیا نیا تعلق جڑا ہے نہ ہی انڈر اسٹینڈنگ ہے، اتنی ٹینشن لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں ہی طبعاً بہت جذباتی ہوں، حسنا دھیمے مزاج کے انسان ہیں، امید ہے وقت کے ساتھ میرے رنگ میں ضرور ڈھل جائیں گے۔ امی کا تو یہی کہنا تھا۔“

☆☆☆

”بیٹا! کچھ یاد ہے کہ بھول گئے، میں ایک ہفتے سے یاد دہانی کر رہی ہوں کہ سائرہ کی سالگرہ ہے، منانی بہت ضروری ہے، وہ کیا سوچے گی کہ کس قدر بے حس اور روکھا خاوند ہے کہ اس کی خوشی کی رتی بھر پروا نہیں۔ نہ ہی تم ہی مون کے لیے تیار ہوئے۔ نہ آج تک اسے باہر ڈنر پر لے گئے۔ تمہاری روٹین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی چھڑوں والی آزادانہ حرکتیں اور باتیں۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ وقت نکالو۔ مجھے ڈر ہے، سائرہ کہیں تمہیں چھوڑ کر میکے ہی نہ چسلی جائے۔ پہلے ہی سب تمہاری شادی کی مخالفت کر رہے تھے اب مجھے طے و تشے مت سنوانا۔“ ماں نے اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی اپنی فکر مندی کا اظہار کیا وہ حیرت سے انہیں دیکھ کر بولے۔

”بڑی عجیب دھمکی دی ہے آپ نے..... سائرہ بانو پاگل یا بے وقوف نہیں۔ بھلا وہ میکے کیوں جائے گی اماں جان، میں نے اسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے، گھوٹے پھرے، جہاں جانا چاہتی ہے بصد شوق جائے، ڈرائیور ہر وقت موجود ہوتا ہے، سیاہ و سفید کی مالک ہے وہ اپنی بیٹیوں کی زندگی ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے اُن متکون مزاج شوہروں کی خوشامدیں اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں جبکہ انہیں اس گھر تک آنے کی اجازت نہیں تو سوچیں کہ کسی اور جگہ سائرہ کی طرح منہ اٹھائے جاسکتی ہیں؟ وہ سائرہ کی زندگی پر رشک کرتی ہیں، سو فیصد محتاج ہیں اپنے شوہروں کی جبکہ سائرہ خود مختار ہے ہر لحاظ سے۔ میں نے بینک کا تمام حساب کتاب لین دین اسی کے سپرد کر دیا ہے۔ نہ میری طرف سے اعتراض ہے نہ ہی کوئی حساب کتاب... اب آپ بتائیں کہ اسے اور کیا چاہیے۔ جس عورت کے پاس آزادی اور پیسہ ہو، اسے تو مرتے دم تک اپنے شوہر کا احسان مند ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر وقت خفگی اور بیزاری کا اظہار کرتے رہنا۔ میں بھی جانتا ہوں بہت اچھی طرح کہ اس معاشرے کا مردانہ دو قوتوں کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ یہی اس کی طاقت ہے، بیوی کو قابو میں رکھنے کی اور اپنی دل جوئی کرانے کی۔ میری تو ایسا کرنے کی نیت ہے نہ ہی میری اس سے کوئی ڈیمانڈ ہے۔ اماں میں نے اس پر ایسا تم تو نہیں کیا مجھے اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ میری طرف سے کوئی کمی نہ ہو۔ آخر کو میں بھی تو جوابدہ ہوں۔“ وہ کتاب ایک طرف رکھ کر طولانی تمہید سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ماں

یہ سب کی سب بہت جاہل خواتین ہیں جنہوں نے بڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے، تم نے بھی ان کی شراکت اختیار کر لی تو مجھے تمہاری ذہانت پر شک ہونے لگے گا اور اپنے فیصلے پر پچھتاوا۔“ حسنا کے سخت الفاظ سن کر اسے ایسے لگا جیسے اس کی زبان میں تاب و طاقت ہی نہیں رہی ہو..... آنکھیں ندامت کے مارے جھک گئیں اور وہ ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے لگی۔ اس کے اندر ایک توڑ پھوڑ جاری تھی۔ کافی دیر خاموشی طاری رہی۔ وہ رعونت سے بھرپور انگلی جھاڑ کا انتظار کرنے لگی جبکہ چہرے کا رنگ تو متغیر ہو چکا تھا۔

حسنا کی بارعب آواز نے ارتکاز کا لمحہ توڑا۔ تو ایک دم سے سوچتے ہوئے چونک کر اچھلی اور ذہن ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت خوب صورت ذہن بخشا ہے، ان فضولیات میں اسے باؤنڈ نہ کر لینا۔ اسے کھلا اور آزاد رکھو تاکہ زندگی کے تمام حسن کا سلسلہ قائم و دائم رہے..... اگر تمہاری ایسی بچکانہ سوچ رہی تو پھر تو سلسلہ منقطع ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ ہماری لڑکیوں کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ رٹو طوطا بن کر ڈگریاں حاصل کر لیں..... استعمال کا سلیقہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔“

”سیر و سیاحت بھی تو ذہن کو وسیع کرتی ہے، مجھے پیرس دیکھنے کا بہت شوق ہے، وہاں کا پروگرام بنائیں ناں ایک تیر سے دو شکار سیاحت بھی اور معلومات بھی۔ آپ نے تو پڑھا ہی ہوگا کہ وہاں کی ہسٹری اور آرٹ کا جواب نہیں۔“ اس نے نرم لہجے میں جیسے خواہش کا اظہار بھی کیا اور خوشامد انداز احتجاج بھی کر ڈالا۔

”نیزہ بازی کی کوئی ضرورت نہیں، کیا وقت ضائع کرنے کے مشورے دے رہی ہو، پیرس کیا کوئی بھی جگہ دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، بک ریڈنگ سے انفارمیشن لو، کمپیوٹر کس لیے ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ گھر بیٹھے بیٹھے۔ اور سیر و تفریح کی سائیٹ میں بھی جاؤ۔ بہت کچھ موجود ہے۔“ وہ خوش مزاجی سے بولنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ بات سن کر اس کا جی چاہا سر پیٹ لے اور بال نوچ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

”وہ تو آپ نے درست فرمایا ہے بہانہ تو یہی مون منانے کا ہے، اس کے پس پردہ بہت کچھ ہے، ایک دوسرے کے مزاج سے آگاہی اور بہت کچھ.....“ وہ بھی قدرے شگفتہ لہجے میں بولی۔ حالانکہ دل لرز رہا تھا۔

”یعنی بد قسمتی سے مڈل کلاس کے لوگوں کا بھی شعور مغربی سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے، باقی مانوسیت تو سراسر دوسرے ہے۔ تم کن اذیتوں کا سودا کرنے چل پڑی ہو۔“ وہ طنزیہ مسکرا کر بولے تو وہ جھینپ گئی۔ ان کے بے رحمانہ رویے پر صابر رہنے پر اکتفا کا سوچ کر اس کی لائٹ براؤن حسین آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اسے لگا جیسے اس نے سر پھر سے ٹکرا کر شدید زخمی کر لیا ہے۔ آخر اس نے اس نرالے اور انوکھے خیالات رکھنے والے انسان کے سامنے خاموشی ہی میں عافیت جانی..... جو انسان بیوی سے غیریت سے بھرپور زندگی رکھنے کا خواہشمند ہے اس کا اللہ ہی مالک ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اسٹڈی کی ہزاروں کتابوں پر جارحانہ نظر... ڈالتی ہوئی وہاں سے ملحقہ اپنے بیڈ روم میں جا کر بستر پر سیدھی لیٹ گئی۔

”مجھے آج حسنا کا انکار کرنا اتنا ناگوار کیوں گزرا ہے، وہ تو پہلے دن سے ہی رومانس سے عاری انسان ہیں۔“ عمروں کا فرق سوچ و خیالات پر بری طرح حاوی ہو گیا تھا۔ ”حالانکہ حسنا نے شادی سے پہلے کون سا مجھے خوشیوں بھرے سبز باغ دکھائے تھے نہ ہی محبت و چاہت سے مغلوب ہو کر وعدے و وعید کیے..... نہ ہی آسمان سے تارے توڑ کر مانگ بھرنے کی بات کی..... پھر میرا دل اس درجہ شگفتگی، افسردگی اور مایوسی میں کیوں گرفتار ہو گیا۔ میں ہی نکاح کے دوبول پڑھ کر ان پر فریفتہ ہو گئی۔ طوعاً و کرہاً جس کا جواب انہیں دینا پڑا تھا۔“ وہ

اک عورت ہونے کے ناتے بے چین اور پریشان نظر آرہی تھیں۔ سمجھانے کے انداز میں بولیں۔
 ”بیٹا ان دو طاقتوں کے ساتھ اپنے ہم سفر کی توجہ و پیار بھی تو چاہیے ہوتا ہے ناں..... جس کے سائے میں جھونپڑی بھی محل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور بھوک و پیاس میں من و سلوکی کا سا احساس تسکین بخشنے لگتا ہے۔ تمہاری حرکتیں مجھے بالکل پسند نہیں۔ خدا کے لیے خود کو بدلنے کی کوشش کرو۔ تم تو میرے بہت تابعدار بچے ہو۔ میری بات پر غور ضرور کرو گے۔“

”اماں جان! امید ہے کہ اب آپ کو میرے شادی سے انکار کی وجہ سمجھ آگئی ہوگی۔ میں ہر بار آپ کو اپنی تمام مجبوریاں بیان کر کے منالیتا تھا مگر اگلے روز پھر وہی رونا دھونا۔ اماں میرے پاس چاؤ چونچلے کرنے کا وقت ہی کہاں ہے؟ صبح آٹھ بجے یونیورسٹی جاتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے واپس آکر کچھ وقت تو میرا اپنا ہونا چاہیے ناں۔ پرائم ٹائم تو یونیورسٹی پر قربان کر آتا ہوں، ان چند گھنٹوں پر میرا بھی تو حق ہے ناں.....“ وہ ماں کے بازو دباتے ہوئے بولے۔

”تم کتنے بچے سوتے ہو؟ تمہارا نہ کوئی آرام کا ٹائم ہے نہ ہی کھانے پینے کا۔ پیاری میری بہو اکیلے ہی کھانا کھاتی ہے اور رات بھر تمہارے انتظار میں کروٹیں بدلتے ہی گزرتی ہوگی۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو دنیا میں تمہاری اس بے پروائی و بے اعتنائی کا ڈھنڈورا پیٹ چکی ہوتی۔ وہ تو بڑی ہی صابر و شاکر لڑکی نکلی، عقلمند ماں کی بیٹی ہے، ورنہ تم یاد ہی رکھتے تمام عمر کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے۔“ اماں جی اسٹک کے سہارے کھڑی ہو گئیں۔
 ”اچھا ہوتا اگر اپنی بیوی کو ڈنر کے لیے لے جاتے۔ موسم بھی بہت خوشگوار ہے اور موقع بھی ہے۔“ وہ آہ بھر کر مزید بولیں۔ ”کسی کی بیٹی لا کر میں نے بہت بڑی غلطی کر دی۔ سوچا تھا کہ تم بیوی کے آنے سے ان نامراد کتابوں کی جان چھوڑ دو گے۔ یہ کوئی زندگی ہے جو تم جی رہے ہو، دل دکھ جاتا ہے میرا۔“
 ”میری پیاری ماں یہی تو اصل اور حقیقی زندگی ہے، گھر بیٹھے بٹھائے دنیا کی اور آسمان و ستاروں کی سیر کرو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”وہ مجھے جوائن کیوں نہیں کر لیتی۔“

”رہنے دو بابا گھر میں ایک پاگل کافی ہے۔“ وہ نخوت سے بولیں۔ ”تمہارے ابا کیا جاہل تھے جو انہوں نے خاندان کے ہر فرد کو وقت دیا۔ میرے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ یہی اسٹڈی جس میں تم بیٹھے ہو ان کی تھی۔ خوب آباد تھی۔ ہر آنے جانے والے کے لیے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا مگر اب کسی چیونٹی کی بھی جرات نہیں اندر آنے کی گستاخی کر جائے۔“ یہ سن کر حسنا کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ کیونکہ انہیں خود پر اسی سلوک و رویے کا زعم تھا کہ انہیں اسے کسی کی پروا ہے ضرورت ہے نہ ہی محتاجی ہے۔ ان کا اپنا وقت اور اپنی پسند کے مطابق گزرتی ہوئی زندگی قابل رشک ہے اور ان کے لیے قابل تسکین بھی۔ اماں جان ہولے ہولے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

اسی اثنا میں سائرہ کے میکے والے ایک اور بے شمار تحائف کے ساتھ گھر میں وارد ہوئے تو ان کے اس طرح اچانک اور بے تکلف رویے پر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے کہ بہت ہی عجیب اور سر پھرے شو باز قسم کے لوگ ہیں کہ ان کے خیال میں ایسے تمام بے ہودہ فنکشنز تو بڑے لوگوں نے اپنے نصیب میں پیسہ صرف کرنے کے لیے خود پر مسلط کر رکھے ہیں۔ سائرہ مڈل کلاس کی لڑکی ہے، انہیں یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ ابھی اسی سوچ و بچار میں محو تھے کہ سائرہ چبکتی ہوئی اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ اس نے سفید شیفون کی کا مدانی کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ گلے اور کانوں میں ڈائمنڈ کا زیور اور ہلکے میک اپ میں وہ

انگ خلش

غضب ڈھا رہی تھی۔ حسنا نے اس پر حیرت سے بھرپور نگاہ ڈالی۔ اس سے پہلے کہ دونوں کی گفتگو شروع ہوتی اس کی بھابیوں اور کزنز نے دھاوا بھول دیا اور انہوں نے چھیڑ خانیاں کیں تو حسنا کی پیشانی پر ناگوار شکنیں ابھر آئیں۔ سب نے سڈے برنج کا پروگرام پی سی کارکھا تو انہوں نے کئی حیلے بہانوں سے جان چمکانے کی کوشش کی حالانکہ انہوں نے اپنے خاندان میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کو ایسی تمام ایکٹیویٹیز میں... پھر پور حصہ لیتے دیکھا تھا۔ مگر وہ ہر وقت اپنی مصروفیت اور وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ان کے ہر پروگرام سے کنارہ کشی اختیار کر جاتے تھے۔ وہ زندگی کی ان دلچسپیوں اور چھوٹی موٹی خوشیوں کو بے ہودگیوں کا نام دیا کرتے تھے اس لیے زندگی کے ان ہنگاموں سے انہیں نہ تو لگاؤ تھا نہ ہی وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کو نہایت بنیادی، آسان اور سہل اصولوں پر گزارنے کے تمنائی تھے۔ سائرہ بانو انہیں تمام لڑکیوں سے مختلف لگی تھی۔ جسے انہوں نے کتابوں میں گم پایا تھا۔ گولڈ میڈلسٹ ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل تھا جو اس بات کی تصدیق تھی کہ وہ بھی اپنا وقت کسی بیکار کے مشاغل میں ضائع کرنے والی لڑکی نہیں بلکہ اس کی سوچ کا محور بھی کتابیں ہی ہیں وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا اسے منتخب کر بیٹھے تھے۔

سائرہ پر اگرچہ ان کی جانب سے کوئی روک ٹوک نہیں تھی پھر بھی برتھ ڈے کا پروگرام شوہر کے بغیر اسے... بڑا مناسب نہ لگا تو وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی۔ بہنوں اور سہیلیوں نے جی بھر کر چھیڑا اسے طیش دلایا۔ اس نے ان کے زور دینے پر حسنا سے ضد کی مصنوعی طور پر رونا دھونا بھی ڈالا۔ دوسروں کے سامنے احساس ندامت کا اظہار بھی کیا مگر سب حسنا کے لیے بچپنا اور اس کا لالہ ابالی پن تھا۔ بھلا وہ اس کا حصہ کیونکر بنتے۔ اس وقت تو بات ٹل گئی تھی۔ اب نئی نویلی دلہن ہر شام ایک نئی پیشکش گوش گزار دیتی اور وہ تلملا کر رہ جاتے۔ ہر ایک رات اسے دو ٹوک لفظوں میں اپنا فیصلہ سنایا۔

میں تمہاری ان بے جا خواہشات کے ساتھ دو گام بھی نہیں چل سکتا۔ ایسی ڈیمانڈ جس میں وقت کا زیاں ہو وہ میں پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہے کہ خود کو مصروف رکھو اور اب پی ایچ ڈی کر کے ایک باعزت اور با مقصد زندگی گزارنے کا پروگرام بناؤ۔ ہماری اسی ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت میں زندگی بہت حسین اور پرسکون طریقوں سے گزر جائے گی۔“ ان کی یہ باتیں سن کر وہ بڑی متحمل مزاجی سے گویا ہوئی۔

”میں اس مشورے کی تہ دل سے قدر کرتی ہوں مگر اس وقت مجھے طویل پڑھائی کے بعد آرام کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے ری ٹیکس ہونے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ پھر مجھے فیملی ریز کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ میری تمام سوچ کا محور نکاح کے بعد بدل چکا ہے۔ اب میرا رول ایک وفا شعار بیوی کا ہے، اس وقت میرا گھر، میرا شوہر، میری سسرال کا ہر رشتہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے بعد بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش میرے تمام فرائض میں سرفہرست ہوگی۔ مجھے بچوں سے والہانہ لگاؤ بھی حد درجہ کا ہے۔ فیملی کمپلیٹ کرنے کے بعد اور... باقی بھی تمام گھریلو ذمے اور فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد تو وقت کا ہر لمحہ میرا اپنا ہوگا۔ اسے مصرف میں لانے کے لیے میں نے ایک ڈھانچا تشکیل دے رکھا ہے۔ یہ آپ کی ہیڈک نہیں..... آپ بے فکر ہیں، میں اپنی پڑھائی کیونکر ضائع کروں گی۔ مجھے خود بھی تو احساس ہے۔“ وہ رسانیت اور سنجیدگی سے کہہ کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ ”میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔ یہ ڈسکشن پھر کبھی سہی۔“

”بیگم کل کس نے دیکھی..... آج کی بات کل پر کیوں چھوڑیں؟ ویسے بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا..... کیسی جاہلانہ باتیں کرتی ہو، کم از کم مجھے تم سے ایسی احمقانہ منطق کی توقع تو ہرگز نہیں تھی۔“

رنگ خلش

انہیں جلا دو، میں مذاق یا طنز انہیں کہہ رہا، آئی ایم سیریس..... کیونکہ اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ وہ کتاب بند کر کے توہین آمیز لہجے میں بولے۔ تو وہ اپنی اس جھک پر انہیں تڑپ کر دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے پر نفرت و حقارت کا ٹھانہیں مارتا سمندر موجزن تھا۔

”جب سے شادی ہوئی ہے میری زندگی ہی بدل گئی۔ نہ رات سونے سے پہلے کتاب پڑھ سکتا ہوں نہ ہی اپنی مرضی سے سو سکتا ہوں نہ جاگ سکتا ہوں، تمہاری پسند کے کپڑے پہنتا ہوں، تمہاری مرضی کے مطابق کھانا کھاتا ہوں، تم نے تو میری زندگی کے ہر لمحے کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میری سانسیں بھی تمہاری اور میری روح بھی تمہاری۔ میرا تو کچھ نہیں رہا۔ تمہی دست ہو گیا ہوں میں۔“ لہجہ زہر آلود تھا۔

”ایسا تو ہر گز نہیں جو آپ نے نقشہ کھینچا ہے۔ آپ تو پچھلے طرح بے مہار اور آزاد ہیں حسنا! آپ جسے ذہین و فطین لوگ نارمل نہیں ہوتے۔ ان کا آئی کیو لیول ایک عام انسان سے بہت ہائی ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی میں کہیں نہ کہیں مار ضرور کھا جاتے ہیں۔ مجھے اب آپ کی مینٹل کنڈیشن کی سمجھ آ گئی ہے، کاش حسنا آپ ایک لو آئی کیو لیول کے نارمل انسان ہوتے تو بہتر تھا۔ جسے زندگی کی قدر ہوتی۔ وقت کی اہمیت کا احساس ہوتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا حسنا۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”اپنے ذہن و قلب کو مطابقت و مفاہمت کا درس سکھائیں۔ آپ کے پاس علم کی کمی نہیں۔“

”بیگم خدا کے لیے اپنی زندگی میں مصروف رہنا سیکھو، اپنی زندگی کو ضائع مت کرو، تمہاری باتوں میں جذباتی پن کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس نے کتابوں کو اپنا دوست بنا لیا اس نے کوہِ ہمالیہ سر کر لیا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر سختی سے بولے۔ ”مجھے اپنا محتاج بنانے کی کوشش مت کرو۔“

”مجھے اولاد چاہیے حسنا..... میں اپنی زندگی کا مقصد پانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میری یہ خواہش جائز ہے کیونکہ عورت چاہے ان پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، ہر عورت ماں کے مقدس رشتے کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ قدرتی امر ہے، یہ تقدس اور عظمت مجھے سوئپ دیجیے پلیز حسنا۔ میری التجا سن لیجیے۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے بچے قطعاً پسند نہیں..... میں نے اپنے لیے اپنے جیسا سا بچہ ڈھونڈا تھا۔ تم تو مجھ سے بالکل ہی الگ نکلیں۔ سارہ میں بچے کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں جو اسے... دے سکوں گا۔“ وہ سنجیدگی اور سختی سے بولے۔ ان کی باتیں اسے شدید حیرت میں مبتلا کر گئیں۔

”مجھے تنگ کرنا چھوڑ دو، جاؤ اپنا کام کرو، صفائی کرو، کھانا پکاؤ، کپڑے دھلائی اور استری کرو، یہ ہے ایک گولڈ میڈلسٹ کا رول؟ چلو بھر پانی میں ڈوب مر جانے کا مقام ہے۔ اب بچے پیدا کرنے کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس پر تمہارا نہیں صرف میرا اختیار ہے۔ اس کا فیصلہ تو میری زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ یہ بات غور سے سن لو اور آئندہ مجھ سے ایسی ڈیمانڈ مت کرنا۔ جو میرا سکون غارت کر دے۔“

”اس پر میرے رب کا اختیار ہے، آپ کا ہے نہ ہی میرا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”جب اس ذات نے حکم کر دیا کہ کن فیکون تو آپ اور میں جھٹلانے والے کون ہوتے ہیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیارات میں بہت کچھ سوئپ رکھا ہے، غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے تمہیں۔ آنکھیں بند کیے کنویں میں کودنے کو اختیارات کا نام دینا حماقت اور نادانی ہے، جس میں تم مقید ہو چکی ہو۔“ وہ بھی بے ساختگی سے بولے۔ ”ہماری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔ رب العزت نے ہمیں اس معاملے میں باختیار رکھا۔ اس کی مہربانی ہے، مجھے بچے کی چاہ نہیں اور میں نے اپنی تقدیر کا رخ موڑ لیا۔ لکھت

وہ رکھائی سے بولے۔ ”تم تو میری بھابیوں اور بہنوں جیسی ایک عام عورت ہی نکلیں۔ کہاں گئی تمہاری تعلیم اور تمام ٹرائف اور میڈلز.....؟ اگر تم نے بچے ہی پیدا کرنے تھے، ملازموں والے کام ہی کرنے تھے تو تعلیم پر اپنا اتنا وقت ضائع کیوں کیا۔ بارہ سال کی عمر میں شادی کرتیں اور تیرہ سال کی عمر میں ایک عدد بچہ پیدا کر چکی ہوتیں۔ مجھے افسوس ہے تمہاری سوچ پر۔“

”مجھے آپ کی کسی بات سے اتفاق نہیں۔“ وہ تملاکراٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میرے اندر کی عورت کو اعلیٰ ترین مقام پر کھڑے ہونے کی خواہش کو آپ رد نہیں کر سکتے۔“

”مجھے بھی تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ آئی تھنک سارہ مجھے لگتا ہے کہ ہم ندی کے دو کنارے ہیں، ساتھ چلتے ہوئے بھی بہت دور..... ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ تمہیں سمجھنے میں مجھ سے بھول ہو گئی۔“ وہ پڑ مردہ لہجے میں بولے۔ ”اور تمہیں مجھے جاننے میں غلط فہمی ہو گئی۔ مجھے پارٹنر چاہیے تھا۔ ویل ایجوکیٹڈ..... جو مجھ سے کتابوں کے بارے میں مختلف نظریات کے بارے میں ڈسکشن کر سکتا۔“

”چلیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”کیونکہ میں تو ایک عام بیوی ہوں، ڈیمانڈنگ..... خود کو بدل نہیں پاؤں گی، قدرتی امر ہے، حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ دونوں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا، کیا جائے؟“ اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ جیسے یہ بہت معمولی سی بات ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بغور دیکھنے لگی۔ جن پر مہندی کی سرخی اور اس کی مہک وقت کی نذر ہو چکی تھی۔ آڑھی ترچھی لکیریں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ آج اسے اپنی دادی کی باتوں میں کسی قدر سچائی نظر آنے لگی تھی۔ جو عموماً ہر پوتی، نواسی کی شادی پر ایک فقرہ بولنا نہیں بھولتی تھیں کہ شادی تو ایک جواب ہے، جس کی ہار اور جیت کا اندازہ اس میں شامل ہونے سے ہی ہوتا ہے۔ جو جیت گیا اس کے وارے نیارے جو ہار گیا وہ بد قسمت کہلایا۔

”سچ ہے کہ میں بھی جوئے کی نذر ہو گئی۔ میری تمام عمر داؤ پر لگ گئی۔ اور یہ دنیا میرے لیے دوزخ سے بھی بدتر آماجگاہ بن گئی۔ یہ ہیں میرے بخت۔“

☆☆☆

”حسنا آپ میری بات پر غور تو کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمیں جلد از جلد اپنی فیملی کمپلیٹ کر لیں چاہیے تاکہ میں وقت سے فارغ ہو کر اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کر سکوں۔ تعلیم میں طویل وقفہ آ گیا تو مجھے دوبارہ جوائن کرنے میں بہت مشکل ہوگی۔“ وہ اسٹڈی میں ان کی آرام چیئر کے قریب صوفے پر بیٹھ کر اپنی ہمت کو یکجا کر کے آہستگی سے بولی۔

مگر حسنا کی طرف سے کوئی جواب آیا نہ ہی نظریں کتاب سے اٹھیں۔ سارہ نے ان کی کتاب پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں نے آپ سے بہت ضروری بات کی ہے حسنا..... کتاب بند کیجیے اور میری اس خواہش پر غور کیجیے۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں، ہر عورت کا ایک حسین خواب ہے یہ۔“ وہ سنجیدگی اور..... سختی سے بولی۔ ”خدا کے لیے میرے خواب پر غور کیجیے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو میری کسی بات کی کوئی وقعت ہی نہیں۔“

”آف جا بلوں والی حرکتیں ہیں تمہاری، تمہاری ایجوکیشن کاغذ کے چند ٹکڑوں تک ہی محدود ہے۔ جاؤ

ہونے کے بجائے ہر اس پریشان ہو گئی۔ حسنا کے پاس اس کے لیے تو ایک پل نہیں تھا آج تین گھنٹے اس پر قربان کرنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیکن یہ معجزہ کیونکر رونما ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

☆☆☆

”تمہاری تمام رپو رٹیں آگئی ہیں، تم جانتی ہو کہ تم نے مجھے کتنا بڑا دھوکا دے ڈالا ہے۔ تم نے ایسا گھناؤنا فریب میرے ساتھ کیوں کیا؟ تب ہی تو میں کہوں کہ تمہارے چہرے پر ہر وقت بارہ کیوں بچے رہتے ہیں؟ مُردنی کیوں چھائی رہتی ہے، میرا شک درست نکلا۔“ وہ جلالی لہجے میں بول رہے تھے، سائرہ نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”معصوم بننے کی ضرورت نہیں.....“ حسنا نے آگے بڑھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر ٹیلیفون کا پتا نکالا۔ جس میں سے صرف دو گولیاں کھائی گئی تھیں۔ حسنا نے قہر آلود نظروں سے گھور کر پتا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”حسنا میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ شاید طبیعت خرابی کی وجہ سے بھول گئی۔ دماغ سے بالکل ہی نکل گیا کہ مجھے میڈیسن میں ناغہ نہیں کرنا۔ اومانی گاڑ، سوری حسنا۔“ وہ مجرمانہ انداز میں بولی۔ ”یہ سوچی سمجھی ترکیب نہیں تھی۔ ایک بھول تھی۔ بھول تو معاف کر سکتے ہیں۔“

”نان سینس.....“ مجھے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں۔ تمہیں بچہ چاہیے تھا، یاد رکھو کہ مجھے دغا اور فریب دے کر تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی وقت اٹھو، میرے ساتھ اسپتال چلو۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت۔“ وہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولے۔

”آپ صبر سے کام لیں، اگر اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان ہو ہی گیا ہے تو اس کا شکر ادا کریں نہ کہ ہم ایک معصوم بچے کے قاتل بن کر جہنمی کہلائیں۔ حسنا یہ تو خاص نظرِ کرم ہوئی ہے ہم پر۔“ وہ خوشی و غمی کے ملے جلے جذبات میں بول رہی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ میرا شک درست ہے کہ تم نے جانتے بوجھتے مجھے اندھیرے میں رکھا۔“ وہ نہ جانے اسے کیا کیا سنا رہے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سے جھاگ ابل پڑا تھا۔ وہ خوفزدہ ہونے کے بجائے دلیر بن گئی تھی۔

”آپ کے رول کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا؟“ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بولی۔

”مجھے جھانسا دے کر تم ہاں نہیں بن سکتیں۔“ وہ زور سے چیخے اور اسے گھسیٹتے بیڈ سے اتار کر بولے۔ ”مجھے بچہ نہیں چاہیے۔ تم کیوں نہیں سمجھتیں۔“

”مگر مجھے بچہ چاہیے۔“ وہ بھی چیخی تو وہ دہل کر پرے ہٹ گئے۔ اس کا یہ روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ تھوڑے تو وقف کے بعد نہایت ملائمت سے بولے۔

”تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو، میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں، صرف ایک سال کی مہلت دے دو۔“

”حسنا میں آپ کو بچے کی کسی ذمہ داری میں شامل نہیں کروں گی۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ مجھ پر نہ سہی اس معصوم پر ہی رحم و ترس کر لیجیے۔ بچے کے معاملے میں آپ کی نفرت اور میری چاہت و پسند کا لیول ایک ہی ہے۔ اگر بچے مارکیٹ میں بک رہے ہوتے تو میں ڈھیر سارے بچوں سے اس گھر کو بارونق بنا ڈالتی۔ میری پسند فطری ہے حسنا۔“ سائرہ نے بڑی لاچاری سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور بڑی بے بسی سے بولی۔

کو مٹا دیا۔ اب دوبارہ کندہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی پر راضی ہو جاؤ۔“ یہ سن کر مزید قیل وقال کیے بغیر وہاں سے اٹھی اور تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر رکے ہوئے آنسو کھل کر بہانے لگی۔ پچھلے تین سال سے وہ جب بھی اس ٹاپک کو چھیڑتی تھی تو حسنا کا یہی نامناسب رد عمل ہوتا تھا۔ پانچ منٹ میں پانچ من بھاری تکلیف دہ طعن لعن سے نوازا جاتا۔ حسنا اس کے جانے کے بعد پھر کتاب میں کھو گئے اور وہ دیر تک آنسوؤں سے دل کے آبلوں کا علاج کرنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر ایک دن اماں جی بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں تو گھر میں کوئی بات کرنے والا نہیں رہا۔ وہ مایوس سی ہو کر رہ گئی تھی۔ حسنا نے کہنا شروع کر دیا تھا۔

”فارغ اور بیکار رہو گی تو تمہارا انجام یہی ہوگا۔ اینگزائٹی، ڈپریشن اور پھر میڈیسن..... اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پی ایچ ڈی گھر کے چند کلو میٹر کے فاصلے سے کر لو گی۔ اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو گی تمہاری۔ لوگ اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ تمہارے گھر میں یہ سہولت میسر ہے۔ تم تو حد درجے نا سمجھ اور بے وقوف نکلیں۔ اپنے دماغ پر تالے مت لگاؤ۔ ورنہ پاگل خانے سدھار جاؤ گی۔ میری بات مان جاؤ، تم سے عمر میں بڑا ہوں، تجربات میں بھی پختہ ہوں۔“

وہ اسے کئی راتوں سے جاگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یونیورسٹی سے واپس آ لے تو اسے بھوکا، پیاسا، بے وقت سویا ہوا پاتے۔ رات بھی لان میں تو کبھی ٹیرس پر ٹپکتے ہوئے گزر جاتی۔ نہ سینے اوڑھنے میں دلچسپی رہی، نہ سہیلیوں کے ساتھ ہلاکلا کرنے کی چاہ رہی۔ گھر کی ہر شے اپنی جگہ سے ہل چکی تھی۔ الماریاں الجھ گئیں، کچن کے برتن گھر بھر میں بکھرے ہوئے تھے، نوکر عیاشی منار ہے تھے، اس تبدیلی کو حسنا نے محسوس تو کیا مگر اسے نظر انداز کر ڈالا تھا۔ انہیں ہمیشہ سے ہی ایسی بے ترتیبی میں رہنے کی عادت تھی۔ انہیں بیڈ روم میں بکھرے ہوئے کپڑے، جوتے اور تکیے، چادریں بے سکون نہ کرتیں۔ باتھ روم میں کاؤنٹر پر بکھری ہوئی اشیاء، گیلے تولیے اور گیلیاں باتھ روم پریشان نہ کرتے۔ اسٹڈی تو الامان، جہاں الماریوں، شیلفوں اور کارپٹ پر کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے بے ترتیب انبار لگے رہتے تھے جنہیں سلیقے اور طریقے سے رکھنا تو درکنار کسی کو چھونے تک کی اجازت نہیں تھی اس لیے سائرہ اسٹڈی میں جھانک کر دیکھتی تک نہیں تھی کیونکہ بے ترتیبی کو ہضم کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیر ارادی طور پر بکھرے ہوئے رسالوں اور اخباروں کو اکٹھا کرنے لگتی تو کڑوی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ ایسی خصلتوں والے شوہر کے ساتھ گزارہ کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا مگر اپنی کمٹ منٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ان کے ساتھ جوانی کے حسین دن کاٹ تو رہی تھی مگر کرب، اذیت اور بے قراری ہمیشہ ہم سفر رہتی تھی پھر بھی اس نے ان سے کنارہ کشی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اتنی مضطرب رہنے لگی تھی کہ کوشش کے باوجود وہ پڑھائی جاری رکھنے میں ناکام رہی تھی۔ طبیعت میں یاسیت تو رچ بس ہی گئی تھی کتاب اٹھانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ زندگی سے لگاؤ اور دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ جس کا اندازہ حسنا کو وقتی طور پر ہوتا مگر زیادہ پریشانی لاحق نہ ہوتی تھی کیونکہ گہرائی میں سوچنے اور مسئلہ حل کرنے کو ان کے پاس وقت کی کمی تھی۔ لاشعوری طور پر سائرہ گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔ رہی سہی کسر دیگر سسرال والوں کی طرف سے ہر وقت کی جانے والی بچے کی ذیما نڈ نے پوری کر دی۔ ذہنی طور پر وہ بے حد کمزور اور لاغر ہو گئی تھی۔ جسمانی طور پر بھی مریضہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اس حالت پر حسنا کا رویہ بدلا..... فکر مندی لاحق ہوئی، اس سے لفظی اپناہیت و انسیت کا اظہار کیے بغیر اسپتال لے گئے، یہ معجزہ شاک کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اتنی بڑی تبدیلی پر وہ خوش

رنگِ خلش

”سائرہ اگر تم تیار ہو چکی ہو تو بتاؤ، میں تمہارے ساتھ اسپتال چلو یا ڈرائیور تمہیں میکے چھوڑ آئے۔“ گھنٹے بھر بعد ان کی آواز آئی جسے سن کر وہ سر تاپا لرز کر بیڈ سے اتر گئی۔

☆☆☆

”حنات! مجھے تم سے ایک سوال کا جواب چاہیے۔ اگر ہماری اماں آج زندہ ہوتیں تو وہ بھی تم سے یہی سوال کرتیں۔ آج تو ان کی روح تڑپ اٹھی ہوگی۔“ بڑی بہن عصمت آئی سی یو میں سائرہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے حنات پر برس رہی تھیں۔ لہجے میں خشکی اور افسردگی تھی اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

”آپا! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ اماں کی روح بے چین کیوں ہوگی؟ کوئی صدقہ خیرات کیے دیتا ہوں میں۔“ وہ انجان بننے ہوئے بولے۔

”بچے کو اس دنیا میں آنے سے روکنے والے تم ہو کہ سائرہ؟“ وہ پڑمردگی سے بولیں۔ ”دیکھو مجھ سے سیدھی اور سچی بات کرو، خبردار جو کچھ چھپانے کی کوشش کی۔“

”ہم دونوں نے مل کر مشورہ کیا اور فیصلہ بھی ہم دونوں کا ہی تھا۔۔۔۔۔ ایک سال بعد فیملی بڑھانے کے بارے میں سوچا جائے گا۔ فی الحال ہم دونوں ہی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ آپا میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں ایک ایسا بچہ پرورش پا رہا ہو جس کی نہ کوئی اہمیت ہو اور نہ ہی وہ والدین کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ وہ بچہ جوان ہو کر بالکل ہی نامکمل اور ادھوری شخصیت کا مالک ہوگا۔“ وہ بڑی خود اعتمادی سے بودا سا جواز پیش کر رہے تھے۔

”تم نے اپنی عمر ملاحظہ فرمائی ہے، جوانی کے بچے والدین کو تمام فرائض سے وقت پر فارغ البال کر دیتے ہیں۔ اب مجھے دیکھو اور باقی بہنوں اور بھائیوں کا موازنہ کرو۔ سب اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد اپنی زندگی کے ہر لمحے سے محفوظ ہو رہے ہیں جبکہ مجھ پر چھوٹی بیٹی کی ذمہ داری کیوں ہے؟ کیونکہ وہ دنیا میں لیٹ بچہ تھی۔ تم نے آج تک اپنے وقت کو ایک روٹین میں سیٹ ہی نہیں کیا۔ ماں جی کہتی تھیں کہ تم شادی کے بعد بالکل بدل جاؤ گے۔ سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کے ساتھ چلنے لگو گے۔ اس کلاک کی ہر سوئی میں اپنا پروگرام فیڈ کرنے لگو گے پھر تمہارے پاس وقت کی کمی نہیں ہوگی۔ بلکہ تمہیں کام کی کمی اور وقت کی زیادتی کا احساس ہونے لگے گا۔ مگر ماں جی کی تھیوری کو نام کام کرنے میں تم تو بے مثال نکلے، کتنے افسوس کا مقام ہے۔۔۔ اپنی تعلیم دیکھو اور اپنی جاہلانہ سوچ کو پرکھو، لگتا ہے، زمانہ جاہلیت کے دور کے باشندے ہو۔“ عصمت آپا نے لمبی سرد آہ بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپا میں انہی صلواتوں اور فضیحتوں کی وجہ سے کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ میری اپنی زندگی ہے اس پر مجھے ہی اختیار ہونا چاہیے۔“ وہ بیزار سی بولے اور سائرہ کی طرف بڑھ گئے۔ جسے ڈاکٹر بلڈ کی دوسری بوتل لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سائرہ کی آنکھوں میں پرلے درجے کی ویرانی اور لا چاری کی تاریکیاں بسیرا کر گئی تھیں۔ لبوں پر نہ ٹوٹنے والی خاموشی تھی۔ حنات نے اس کے بالوں پر نہایت ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ سائرہ نے ناگواری سے ان کا ہاتھ پرے کو ہٹا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ حنات نے ندامت بھری نظروں سے عصمت آپا کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں کی زبان پڑھ کر بے نیازی و بے پروائی کا سہارا لیتے ہوئے بولے۔ ”اب سائرہ کی حالت بہتر ہے فکر کی بات نہیں۔ آبا! میں اب چلتا ہوں۔۔۔۔۔ آج مجھے ایک بہت اہم میٹنگ کے لیے HEC جانا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی قسم کی فکر نہیں ہوگی۔“

”تم میری غیر موجودگی میں بھی کسی قسم کا کوئی پر اہم محسوس نہیں کرو گے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اپنے جیون

”پھر وہی جاہلانہ و بے وقوفانہ راگ۔۔۔۔۔ میری زندگی میں تو ایسا ہونے والا نہیں، یہاں بچے کی آواز ناقابل برداشت ہے۔ بچے کا رونا اور چیخ و پکار۔ اس گھر کا سکون و قرار غارت مت کرو، ورنہ یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“ وہ تقریباً چیخ کر بولے۔ ”پھر بھی میں ایک سال بعد کا وعدہ کر رہا ہوں، اسٹامپ پیپر لاؤ لکھ دیتا ہوں۔۔۔۔۔ فی الحال اس وقت میری طرف سے اجازت نہیں۔“

”اور اس معصوم کا کھیلنا کودنا، قلقلاریاں کرنا، تو تلی میٹھی، میٹھی باتیں کرنا اسے کیا نام دیں گے آپ؟ گھر کی خاموشی میں گہما گہمی اور رونق سا جائے گی۔ مجھے تو اس دن کا ابھی سے انتظار رہنے لگا ہے۔“ وہ بچے کے فسوں میں کھو کر بولی۔

”سائرہ تم میری بات کو نظر انداز کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتیں۔“ وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

”فورا تیار ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے وجود سے گھن آنے لگی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے ہی نکال دوں، ہماری اچھی گزر رہی ہے، اسی طرح اس زندگی کو گزر جانے دو پلیز۔ اتنا اہم اور عظیم فیصلہ کرنے کے لیے مجھے وقت چاہیے۔ ذہنی طور پر تیار ہونے کا فائدہ نہ تو مجھے ہوگا نہ ہی تمہیں بلکہ آنے والے بچے کو اس کا فائدہ ہوگا۔ جسے ہم کو الٹی ٹائم دے سکیں گے۔“ وہ اب اسے اپنی بانہوں میں بھر کر نرمی سے بولے تو سائرہ رحمہ اللہ نظروں سے اٹھیں دیکھنے لگی۔

”حنات! پلیز صرف ایک بچے کی التجا ہے، دوسرے کا نام نہ لوں گی۔“ وہ ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنا سر ان کے سینے سے لگا کر التجائیہ انداز میں بولی۔

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“ انہوں نے اسے جھٹکے سے پرے کیا تو اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تکیے پر گر گئی۔ وہ اس کی سائڈ پر بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس منانے میں کبھی جاڑے کی کپکپی تو گرما کی چھین کا کھیل جاری تھا مگر وہ ایسی قبیح حرکت ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ جھٹکا لگنے سے اس کا سر چکرانے لگا تھا اور متلی ہونے لگی تھی۔

”مجھے آپ کی ناراضی۔۔۔ بیکار کے اعتراض اور اس شدید رد عمل کی قطعاً پروا نہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ مجھے ایک مکمل عورت بننے کا حق قدرتی طور پر انعام کی صورت میں سونپا گیا ہے اس لیے ایک معصوم سی جان کے قتل کے تصور سے ہی میرے رگ و ریشے میں ہم دونوں کے زوال اور سزا کا ڈر خوف سراپت کر گیا ہے۔ حنات آپ نے ہر مفکر اور مولانا کی تفسیروں کو کھنگال رکھا ہے۔ کیا یہی فرمان الہی ہے کہ آنے والی روح پر آپ قابض ہو جائیں اس پر تو ہمارے مالک کا اختیار ہے۔“ وہ اس لمحے خود سے بے خبر بیزار سی اور ابھرنے سے بولی تو اس کے حوصلے۔۔۔ ہمت اور مقابلہ کرنے کی جرات کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے حق دق دیکھنے لگے۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف بھاگی اور اس کی قے کرنے کی آواز سن کر حنات نے نفرت اور حقارت سے اندر جھانکا اور قہر آلود لہجے میں بولے۔

”تم کان کھول کر سن لو، اگر ایک گھنٹے میں تیار نہیں ہوئیں تو اپنے باپ کے گھر جانے کی تیاری کرنے میں دیر مت لگانا۔ مجھے تم جیسا خود سر، دھری شخصیت کا مالک جیون ساسھی نہیں چاہیے۔ حنات نے اس پر ایک اچھتی ہوئی ناگوار نظر ڈالی اور وہاں سے چلے گئے۔

”آپ کی اس انہونی خواہش کی میں کبھی تائید نہیں کروں گی۔ میں آپ کی بہترین ہم سفر نہ سہی آپ کی دشمن ہی سہی، مجھے منظور ہے مگر یہ گناہ کبیرہ کبھی نہیں کروں گی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کروش بدل کر لیٹ گئی۔

رنگِ خلش

ہم دونوں نے اپنے تعلق و ربط اور رشتے کا بنا رکھا ہے، ریزہ ریزہ ہمارے گردوں۔ ایسا کرنے سے خاندان کی عزت و وقار تاراج ہو جائے گا۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ معاشرہ مجھے قبول نہیں کرے گا۔ میری کمزوریوں اور بزدلی کو سمجھتے ہوئے تم میری قدر دانی کرنے کے بجائے مجھے آلتو فالتو بے جان شے سمجھ کر اپنی خود ساختہ عارضی اور وقتی دنیا میں کھو گئے ہو۔ مجھے مر کر ہی تم سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔ تمہیں تو جب بھی گلٹ (شرمندگی) بیدار نہ کر سکے گا، تم ہو ہی پتھر سے بنے ہوئے انسان، میں تمہیں بھی ایسی ماردوں کی کہ کیا یاد کرو گے؟ کہ تم نے عورت کو اس قدر حقیر جانا، اتنا مجبور سمجھا۔ وہ خود کلامی کرتی ہوئی بیڈ سے نیچے اتری۔ ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی وہ اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کو کھول کر کاؤچ پر سوئے ہوئے حنات کو دیکھنے لگی۔ وہ پینٹ شرٹ ہی پہنے سکر کر لیٹے ہوئے گہری نیند میں تھے۔ گیس ہیٹر آن تھا اس نے آگے بڑھ کر ہیٹر آف کیا اور بیڈ روم سے کمر اٹھا کر ان پر ڈال دیا۔

☆☆☆

”سارہ، تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ تم میری بیٹی جیسی ہو اس لیے تمہیں سمجھنا ضروری سمجھتی ہوں۔ ہر وقت ماتمی حالت میں رہنا شوہر کو قطعاً پسند نہیں ہوتا۔ اس کی نظریں کسی اور کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ دل میں کوئی اور بسنے لگتا ہے اور بیوی کو اس وقت خبر ہوتی ہے جب دوسری عورت اس کے گھر پر قابض ہو جاتی ہے۔“ عصمت آپا نے گھر میں قدم رکھتے ہی سارہ کو اول جلول حالت میں دیکھ کر سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”آپ کے بھائی کو یہ سب کرنے کا وقت ہی کب ہے؟“ وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو میٹھتے ہوئے بولی۔ انہیں تو کسی حور پری میں بھی کوئی چارم نظر نہیں آتا۔

”ہمارے معاشرے کی عورت کا دل گوشت پوست کا نہیں پتھر کا ہو تو تب وہ اپنی زندگی میں کامیاب مانی جاتی ہے۔ دل کو روگ لگا لینا اور اپنے ذہن کو بے لگام رکھ کر سوچے چلے جانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ میری منی سی بھابی اپنی سوچ پر قفل لگا دو تا کہ تمہارے من میں کسی آرزو کا دخل ہی نہ ہو۔ کوئی سوچ ہی نہ ابھرے۔“ وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

”اس سوچ کو جس پر میرا حق ہے، عصمت آپا اسے قید کیسے کر دوں؟ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ آپ بھی تو میری ہم نفس ہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کا اختیار رکھتی ہیں۔ آپ تو میرے احساسات و جذبات سے واقف ہیں۔“ وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ ”مجھے اولاد چاہیے عصمت آپا، بس اور کچھ بھی نہیں۔“

”تو پھر ایک ہی علاج ہے۔“ عصمت نے سوچتے ہوئے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ علاج بتائیے آپا؟“ وہ ایک دم سے چوکنی ہو کر بولی۔

”حنات کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہوگا۔“ وہ بے اختیار سے بولیں۔

”نہیں آپا، یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ آئی لوہم۔۔۔۔۔ میرے بغیر وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ ان کے کھانے پینے کا، ان کے آرام کا کون خیال رکھے گا۔ وہ تو خود سے بھی اتنے بیگانہ رہتے ہیں کہ دو دن کھانا نہ ملے تو کبھی بھوک کا اظہار نہیں کرتے، کپڑے تیار نہ کروں تو بغیر استری شدہ کپڑے پہن کر یونیورسٹی چل پڑتے ہیں، ایسے لوگ کمزور ہوتے ہیں، کیئر نہ کریں تو فوراً ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور نوکروں کی حالت سے تو آپ اچھی طرح

ساتھی کے لیے بھی اتنے ہی بے حس اور بے پروا ہو گئے تو تمہاری شادی نہ ہونے دیتی۔“ وہ دل میں ہی کہتی ہوئی کھول گئیں۔ ان کا دل چاہا اس ارسطو، افلاطون اور سقراط کے منہ پر پتھروں کی بارش کر دیں۔

”میننگ کے بعد آنے کی کوشش کروں گا۔ بس سارہ کو تسلی و تسفی دیتے جیے گا۔ اور سمجھائیے گا کہ وہ ہے تو بچوں کی قلت نہیں ہوگی۔ اس وقت ری کور کرنا ضروری ہے۔“ وہ آہستگی سے بولے اور سارہ کی طرف خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑے۔ بیٹی کے مقدر لکھنے کا اختیار والدین کو سونپا جاتا تو کیا ہی خوب ہوتا۔ کبھی دل نالاں نہ ہوتا، آنکھ میں جھڑی نہ لگتی، نیندیں نہ اڑتیں اور ایسے ناہنجار مرد ہمیشہ کے لیے تنہائی کا شکار ہو جاتے۔ دوسروں کی لاڈلی بیٹیاں ان کے من گھڑت و من پسند اصولوں کی بھیینٹ چڑھنے سے بچ گئی ہوتیں۔ وہ سارہ کی طرف ترس و رحمہ لانہ نظروں سے دیکھ کر سوچے جارہی تھی۔ اس حالت میں وہ کسی قسم کا سوال پوچھ کر اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لیے خاموشی سے اس کے قریب ہی رکھے اسٹول پر بیٹھ گئیں اور خود کو لعنت ملا مت کرنے لگیں جنہوں نے اپنے بھائی کی تمام خصلتوں اور عادات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اس کی شادی کی حمایت کر ڈالی تھی محض اسے سدھارنے کی امید و بیم میں ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرتے ہوئے اماں جان کو خوفِ خدا کیوں نہیں آیا۔

☆☆☆

”سارہ اب کیسا فیل کر رہی ہو؟“ حنات نے بیڈ روم سے ملحقہ اسٹڈی سے جھانکتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

”اللہ کا کرم ہے۔“ وہ منمنائی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ حنات نے اس کے قریب آنے کے بجائے وہیں سے واپسی کو بہتر سمجھا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کسی ڈیلی نیوز کے لیے لکھے ہوئے آرٹیکلز پر نظریں جما کر بیٹھ گئے۔ جب اپنے فسوں سے باہر نکلے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایک تسلی بخش بھرپور انگڑائی لے کر انہوں نے وہیں رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا کر غٹا غٹا پینے لگے۔ پھر بیڈ روم میں جھانکا۔ سارہ نے جنہش نہ کی تھی کیونکہ وہ ٹریکولائزر لے کر سوچ چکی تھی۔ انہوں نے ایک طویل سانس لی اور عینک اتار کر واپس اسٹڈی میں چلے گئے۔ لائٹس آف کر کے وہیں کاؤچ پر لیٹ گئے۔ چند سیکنڈ میں ہی ان کے زوردار خراٹے اسٹڈی کے کھلے دروازے سے ملحقہ بیڈ روم کی فضا میں منتشر ہونے لگے۔ ان کی بے ڈھنگی آواز میں اس قدر انتشار تھا کہ سارہ مصنوعی گہری نیند کے باوجود ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

اس نے بے اختیار ہی میں حنات کی سائڈ پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں وہاں موجود نہ پا کر لاشعوری طور پر اس نے اک طویل آہ بھری اور نیند جو کھل چکی تھی۔ اب تمام سوچوں کے ہمراہ مکمل طور پر کچھو کے لگانے لگی تھی۔ ذہن کو ہر سوچ سے بے بہرہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی چلی گئیں تو وہ اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”حنات تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ محض اپنی ماں کو خوش کرنے کی خاطر میری ہنستی مسکراتی زندگی کے خریدار کیوں بن گئے۔ تمہیں بیوی کی ضرورت کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر اتنا بڑا ظلم کرتے ہوئے تمہارا دل خوفِ خدا سے لرزا کیوں نہ تھا۔ اب مجھے اس سوال کا جواب دو کہ پہاڑ جیسی جوانی کا اتنا طویل سفر کیسے کئے گا۔ کیا اسی طرح تنہا اور لاوارث و بے کس عورت کی طرح آہ و بکا کرتے ہی ساری زندگی بتا دوں گی؟“ وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ ”میرے اندر کے تمام بھیا نک احساسات کو اپنی قربت اور پیار سے ختم کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا والوں کے سامنے تمہاری اصلیت کو تار تار۔۔۔ کر دوں، یہ جوامج

انگ خلش

”کبھی کبھار بڑوں کی بات مان لینے میں بے حساب فوائد ہوتے ہیں، میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ تم نے آخر کار میری اس تجویز پر غور کیا۔ کسی کے سامنے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ ہر ایک کن سونیاں لینے لگے گا۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولیں۔ ”اب اگلی شنگ کب ہے؟ تاکہ میں تیار رہوں۔“

”ایک ہفتے بعد انہوں نے بلایا ہے، عصمت آپا! اب میں آپ کو تکلیف نہیں دوں گی، خود ہی آجاؤں گی۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ میں ہوں بالکل ٹھیک ٹھاک۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”وہ تو ہے..... پھر بھی شک کو اپنا رفیق کیونکر بنائیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کچھ تو قیمت ادا کرنا ہی پڑے گی ناں۔ اور وہ قیمت ہے ڈاکٹر ہمایوں۔“

”اور ان کے مشورے پر عمل کرنا۔“ وہ بھی ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو دونوں مطمئن اور پرسکون سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ آخر ڈاکٹر ہمایوں نے اس کی صحت یابی کو محسوس کرتے ہوئے اس کی میڈیسن کو آہستہ، آہستہ کم کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ اس عارضی اور وقتی سہارے کے بغیر اپنی زندگی پر گامزن رہ سکے۔ اسے میڈیسن کو خدا حافظ کہنا مشکل نہ تھا۔ مگر ہمایوں کو الوداع کہنا وبال جان بن گیا۔ چہرے پر تسکین و طمانیت میں بے چینی و بے قراری کی آمیزش نظر آنے لگی۔ گھر پھر سے بکھر نے لگا۔ خوش لباسی و خوش گفتاری پر منفی سوچوں کی چھاپ لگنے لگی۔ حسنا کی ہر بات اور ہر حرکت پر پھر سے اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی۔ اس کے مزاج کی اس تبدیلی کو حسنا جیسے بے حس و خود غرض انسان نے بھی بری طرح محسوس کر لیا تھا۔ مگر اس سے پوچھنا اور اپنا وقت اس غیر مناسب مسئلے کی نذر کر دینا انہیں قطعی منظور نہیں تھا۔ آج اور کل میں ہی دن گزرتے گئے۔ مگر وہ اس کی

واقف ہیں۔ بھلا وہ پروا کیوں کریں گے۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”تو پھر بچے، خود کو سنبھالو اور اپنی ان تمام خواہشات کو اپنے دل سے نکال دو، جن سے حسنا کا دور پار کا بھی واسطہ نہیں۔ ورنہ روگ لگائے بیمار پڑ جاؤ گی۔“ آپا نے نہایت پیار و ملامت سے کہا۔ ”حسنا تو ہمیشہ سے ہی لکی تھا۔ تمہارے جیسی بیوی کا حصول تو اس کی خوش بختی کی نشانی ہے، تم اس کے کہنے کے مطابق اپنی پڑھائی شروع کر دو، دل بھی بہل جائے گا۔ حسنا بھی تم سے خوش ہو جائے گا پھر ممکن ہے کہ تمہاری تمنا پر غور و خوض کرنے پر مجبور ہو جائے۔“

”ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے آپا، ہم روز بروز اپنی عمر میں، آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔“ وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی۔ ”مجھ میں مزید پڑھنے کی سکت نہیں رہی، جب دل میں جینے کی امنگ ہی نہ رہے تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی اس بے مقصد زندگی سے پیار ہے نہ ہی اس کی چاہ ہے۔“

”بیٹا اس طرح تو تم ڈپریشن میں جا رہی ہو، کسی کے سامنے ایسی مایوس کن باتیں مت کرنا، سب تمہیں پاگل کا خطاب دے کر تمہارا مسخراڑا بنیں گے۔ ڈپریشن کا علاج ہے، تم بھی تو اچھی طرح جانتی ہو۔۔۔“ آپا خوف زدہ سی ہو کر بولیں۔ ”کسی سائیکالٹرسٹ سے مشورہ لینے میں کوئی قباحت نہیں، میں ابھی بات کرتی ہوں حسنا سے۔“

”اس کی ضرورت نہیں آپا، میں ٹھیک ہوں، میرے ڈپریشن کو بیماری کا نام دینا درست نہیں۔ یہ تو حالات کی وجہ سے مجھ پر طاری ہوتا جا رہا ہے، اپنے بھائی کو سمجھائیں کہ میری خوشیوں اور راحتوں کو اپنی غرض اور اپنی چاہ کی بھینٹ مت چڑھائیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”آپا جان، یقین کریں میں ضد نہیں کر رہی۔ حسنا سے جب بھی بات کرتی ہوں، مجھے ضدی بچہ کہہ کر میری بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے اس دنیا کا ہر فرد مجھے قصور وار ٹھہرا رہا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں..... آپ سب لوگ میرے بچے کے قاتل ہیں، میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گی اور اگلی دنیا میں اپنے اسی معصوم ان دیکھے بچے کی انگلی پکڑ کر پل صراط پار کر کے جنت میں داخل ہو جاؤں گی۔ حسنا اور سب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔“ وہ بچوں کی طرح ہلکے بلکے بلکے کر رونے لگی۔ تو عصمت کی آنکھوں سے بھی ساون کی جھڑی پھوٹ نکلی۔

☆☆☆

”ڈاکٹر صاحب، آپا خواہ مخواہ اتنی فکر مند ہو گئی ہیں، میں ٹھیک ہی تو ہوں۔“ سائرہ نے ماہر نفسیات ڈاکٹر ہمایوں سے خود اعتمادی سے کہا تو وہ مسکرا کر اپنا نیت سے اسے دیکھنے لگے۔ عصمت نے ہمایوں کے آنکھ کے اشارے کو سمجھ لیا اور چپکے سے باہر وینگ روم میں جا بیٹھیں۔ آپا نے سائرہ کے منع کرنے کے باوجود دو ہفتوں میں ہی ماہر نفسیات سے ٹائم لے لیا تھا یہ ایک تجربے کا راور اچھی شہرت کے حامل.... ڈیڑھ گھنٹے کی طویل گفتگو کے بعد جب سائرہ باہر نکلی تو اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور ناک لال ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود چہرے پر اضطرابی کیفیت میں خاصی کی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔ عصمت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل کر پارکنگ کی طرف چل دیں۔

”سائرہ جان، ڈاکٹر ہمایوں کیسے لگے؟“ عصمت نے آہستگی سے کہا۔

”بہت اچھے، مسیحا اور ہمدرد، آپ کا بہت بہت شکریہ، بہت قابل ڈاکٹر ہیں، دل کی بات کو پکڑنا خوب آتا ہے۔“ وہ پُرسٹائش لہجے میں بولی۔

احتساب

شاید سیاست کی بنیاد جمع دوپانچ پر رکھی جاتی ہے تب ہی معاشرے میں توازن کی حالت بگڑی ہوئی ہے، آخری صفحات پر **ش صغیر ادیب** کا شاہکار

تصویر زوال

تاریخ کے الٹ پھیر کا گھن چکر..... بدلتے چہروں کے درمیان ماضی کے ملتے جلتے واقعات کی ترتیب..... ابتدائی صفحات پر **ایچ اقبال** کی سوغات

ستاروں پر کمند

ظاہر جاوید مغل کے زیر قلم پستی سے بلندی کی جانب رواں دواں مسافر کی دلربا داستان کا اگلا پڑاؤ

ماروی

محی الدین نواب کے خیالات کی روانی..... سرحدوں کو پار کر کے محبت کی حدود کو چھونے والے کرداروں کے معصوم ارادوں کی داستان

اکتوبر 2014ء

خطوطِ مری کی کہانیاں
سینس
ماہنامہ

مزید
خطوطِ مری کی کہانیاں
سینس
ماہنامہ

خطوطِ مری کی کہانیاں
سینس
ماہنامہ

طبیعت کی تبدیلی کی وجہ پوچھنے سے کئی کتر اتے رہے اور اپنی زندگی میں مصروف و شاداں رہے۔ یہ تا مناسب رد عمل سا رہ کو بتدریج کھوکھلا کرتا گیا۔ ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی تڑپ اس کے دل میں بڑھنے لگی۔ وہ ماضی میں گم سی ہو کر حسرت و یاس سے سوچنے لگی۔ وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب میری پہلی ملاقات ڈاکٹر ہمایوں سے ہوئی تھی اور سالوں بعد میں نے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ دل کو کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا اور وہ میرے دل کے زخموں پر اپنی گفتگو کی چاشنی سے مرہم رکھ رہے تھے اور میرا درد ایک دم سے کم ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بے قرار دل نے سکون و اطمینان کی کھنٹی بجاکر میرے ذہن کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اس میں مثبت سوچوں نے بسیرا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ دوسرے وزٹ پر ہی وہ مجھے اپنے مرنی اور مسیحا لگے۔ میں نے یونیورسٹی اور حنات کی سخت مزاجی کے قصے اور اپنی لیاقت کے بارے میں تفصیلاً انفارمیشن دے کر انہیں امپریس کر ڈالا تھا۔ وہ میری ذہنی صحت کے لیے فکر مند رہنے لگے تھے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے زندگی کی تمام تر دلچسپیوں اور رعنائیوں میں واپس لانا چاہتے تھے۔ وہ انہماک سے میری ہر بات سن کر اہمیت دیتے اور پھر خوب مدح سرائی کرتے، لطیفے سناتے اور میرے بچپن کی شرارتیں سن کر محظوظ ہوتے۔ میرے ساتھ ایسا سلوک و رویہ حنات کا تو کبھی نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ہمایوں سائیکسی جان چکے تھے میرے مرض کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شہد میں ڈوبی ہوئی میری پسند کی باتیں ساعتوں میں تحلیل ہو کر مجھے ذہنی طور پر زندگی کے قریب تر کرتی گئیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر اپنی دنیا میں واپس آئی ہوں تو پھر دوبارہ اسی فیر میں کیوں چلی گئی ہوں؟ وہ سوچنے لگی اور اس سچائی اور حقیقت کو جان کر کہ وہ ڈاکٹر ہمایوں کی کمپنی کو پسند کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے دل کے بہت نزدیک محسوس کرتے ہوئے وہ دہل سی گئی تھی۔ اس بے قراری اور اضطرابی کیفیت میں کئی راتیں گزریں۔ خود کو سمجھانے کے باوجود اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ دل میں ڈاکٹر ہمایوں سے ملنے کی ہوک تمام ارادوں پر چھا جاتی۔ جب احساس گناہ آنکھ کھولتا تو خود کو لعنت ملامت کرتی کہ یہ وہ کس دوار ہے پر چل پڑی ہے۔ آخر اپنی ذہنی طمانیت اور دلی سکون کی خاطر اس نے ڈاکٹر ہمایوں کو فون کرنے سے پہلے خود کو تیار کیا کہ وہ محض ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہے، زبان کی مٹھاس اور شگفتہ و جاندار انداز گفتگو اس کا پیشہ ہے اور اس کا یہی انداز مریض کو سب سے زیادہ بھاتا ہے۔ خصوصاً صنف نازک کو مگر یہ اس کا پروفیشنل انداز تھا۔ ورنہ وہ نفسیات کا ماہر ڈاکٹر نہ ہوتا بلکہ سرجن ہوتا۔ چھری، چنگی کے ہمراہ۔

ڈاکٹر نہ ہونا بلکہ سرن ہونا۔ پرسی اپنی سے ہمراہ۔
 ”کہیں اس کی میٹھی زبان میرے دل پر چھری کا کام تو نہیں کر گئی۔ اوہ مائی گاڈ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، کیا میں اتنی ہی کمزور واقع ہوئی ہوں، ویری ہیڈ۔“ اگلے ہی لمحے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ”اپنے دل کو مضبوط کرو اور ذہن کو جگا کر سوچو۔ تم غلطی پر ہو، ڈاکٹر ہمایوں صرف تمہارا معالج ہے۔ تمہاری ذہنی اختراعات تمہیں کسی اور ڈگر پر دھکیل رہی ہیں، وہ ڈگر آگ ہے، جہنم اور بھڑکتے ہوئے شعلے اور چنگاریاں ہیں۔“
 ”نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔“ دل کی اس آواز پر ایک دفعہ وہ ہوش میں آئی اور اپنے وجود میں قوت و طاقت کو بحال کرتی رہی۔ جب اس نے خود کو قدرے نارمل محسوس کیا تو ڈاکٹر ہمایوں کو فون ملانے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں پھرتی اور چستی تھی۔ مزاج کا چڑچڑاپن اور کرب و اذیت کا جان لیوا احساس قدرے کم پڑ گیا تھا کیونکہ اس نے اس بات پر سہر تسلیم خم کر لیا تھا کہ وہ محض اس کا ڈاکٹر ہے اور یہ اس کی پیشین گوئی ہے، جو ابھی اس کی نرم و ملائم خوشگوار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو تمام خود سے کیے گئے عہد و پیمان اور ارادے متزلزل ہونے لگے۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں کے دوش پر اڑتی جا رہی ہے۔ اس کے دل میں مسرت و راحت کی شہنائیاں بجنے لگی ہیں۔ اس سے وزٹ کا ناٹم لے کر جو ننھی موبائل آف کیا تو اپنے سامنے قد آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر اچنبھے سے خود پر غور کرنے لگی۔ میلے کھیلے سلوٹوں سے بھر پور کپڑے اور الجھے ہوئے کھلے بال اور چہرے پر شگفتہ گلاب جیسی لالی اور مسحور کن مسکان کے اس امتزاج میں وہ کس قدر پرسکون لگ رہی تھی۔ اس نے خود سے ہی سوال کیا۔

”ایسا کیوں ہے؟“ برصغیر جواب سننے کی ہمت نہیں تھی۔
 ”کیا پسندیدگی ہے یا تحقیر اس کی خوشگوار و شگفتہ باتوں کا اثر ہے؟ تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو، خود کو
 بے وقوف مت بناؤ۔“ انصاف کو تہ نظر رکھ کر وہ اپنی ماں کی باتوں پر غور کرنے لگی۔

”جس رشتے کے سامنے کمزور پڑ جاؤ، سمجھو کہ تم پر زوال آنے والا ہے، جہاں سے سکون ملے، سمجھو کہ تم اپنا ج ہو گئی، جس کی چاہ میں پاگل ہونے لگو وہ رستہ چھوڑ دو۔“ اور آخر اس نے اپنے من سے ڈپریشن کے بیج کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی ٹھان لی۔ جس میں ڈاکٹر ہمایوں کی میٹھی اور تسلی بخش باتوں کی ضرورت رہی نہ اس نے کسی دوا کے سہارے کو محسوس کیا۔ وہ اپنی دیرینہ اور اہم خواہش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی ماہر نفسیات خود ہی بنی۔ یہ اٹل فیصلہ تھا، ”وہ حسنت کی ہے اور اس کے ذہن و قلب پر اسی کی اجارہ داری رہے گی۔ ڈاکٹر ہمایوں کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔“

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کے چہرے پر اطمینان کی سرخی بکھرنے لگی اور اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی صحت پر دے ڈالی۔ بکھرا ہوا گھر اس کے مزاج کے مانند سلجھ گیا تھا اور ایک دن منوں بھاری خبر سن کر اس نے اسے اپنے ہی دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا۔ اس بار وہ حسنت کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ وہ ان نازک گھڑیوں سے نکل کر یہ مژدہ راحت حسنت کے گوش گزار ناچا ہتی تھی۔ اسے دھماکے کی خبر تو تھی مگر وہ اسے عارضی لگ رہا تھا۔ ایک معمولی جھٹکا اور پھر بلکے شا کس کے بعد سکون ہی سکون..... اور شکرانہ ہی شکرانہ.....

☆☆☆

بانچ مہینے کا عرصہ طبیعت کی خرابی کے باوجود نہایت تسلی و تشفی میں گزر گیا۔ حسنت حسب معمول اپنی کتابی دنیا میں مگن اس کی نقاہت اور چہرے کی پیلاہٹ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ سائرہ کی معمولی سی احتیاط نے اس راز پر پردہ ڈالے رکھا۔ جب اس کی بڑھتی ہوئی جسمانی ہیئت پر خاندان کی عورتوں نے معنی خیز سوال کرنے شروع کیے تو سائرہ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ دل اچھل کر حلق میں آنے لگا کہ اب وہ وقت آچکا ہے کہ اس حسین بھید کی پردہ کشائی کی جائے۔ اس سے پہلے کہ دوسروں کی طرف سے یہ خبر مبارک کی صورت میں حسنت کے کانوں میں زہر اندیل ڈالے، کیوں نہ خود ہی شربنی سے بھرپور معجزہ ان کے گوش گزار دے۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔۔۔

فی الحال اسے اس مشکل مرحلے کا نہایت دانشمندی سے سامنا کرنا تھا۔ اسے حیرت تھی حسنت اس کی ظاہری حالت سے اس قدر بے پروا تھے۔ حسنت بستر پر نیم دراز اپنا پسندیدہ مشغلہ سائرہ پر مسلط کر رہے تھے۔ space کے معجزات کا ذکر، دنیا کے وجود میں آنے کی تھیوری اور مختلف مرتد رائٹرز کے غیر مناسب اور بے تکی خیالات سنتے ہوئے یہ صرف ہوں، ہاں یا، ایس کا ہی سہارا لیا کرتی تھی۔ اسے ان باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا مگر وہ جو بڑھتے اے ٹو ڈی اس سے شیر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بہترین سامع بھی جبکہ وہ اس کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا معیار ان کی سوچ کے مطابق زیر و تھا۔

آج انہیں خوشگوار موڈ میں دیکھ کر سائرہ نے موقع غنیمت جانا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر الفاظ کی ادائیگی سے پہلے تھوڑا خوف زدہ ہو کر لرزی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔

”کچھ پریشان سی ہو گئی ہو ایک دم سے..... کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی وسعت کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو گئی ہو؟“ وہ حیرت سے بولے تو بہ مشکل اس کی زبان نے جنبش کی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں دیکھ کر ہر بار رب العزت اور آپا کا شکر ادا کرنے لگتا ہوں کہ آج جو تم ہو، انہی کی مہربانیوں کی وجہ سے ہو، میں نے آپا کی عقلمندی اور دور اندیشی سے ایک سبق عمر بھر کے لیے سیکھ لیا ہے کہ اداسی، بدگمانی، بے یقینی اور مایوسی کے وار دہوتے ہی ماہر نفسیات سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ وہ ملائمت بھرے لہجے میں بولے۔

”حسنات! ماہر نفسیات کا کوئی کمال نہیں، ہمیں اپنا موازنہ خود کرنا چاہیے اگر ہم پیدائشی طور پر نارمل ہیں، صحت مند ہیں، بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے نشیب و فراز سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ بچوں کے ذہنی ٹیسٹ لینے سے ہمیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ اپنے خراب رزلٹ کو بچے نے کس طریقے سے لیا ہے۔ ناکامی پر دوبارہ کمر بستہ ہونے کا فیصلہ بہ آسانی کر سکتے ہیں یا دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا۔ دوسروں کے سامنے شرمندگی منانے کے لیے دوسروں کو ہی مورد الزام ٹھہرائے گا یا اپنی نالائقی اور غلطی کا اعتراف کرنے میں اس کی انا و خود داری کو جھکا تو نہیں لگے گا۔ بس آئندہ بھی زندگی میں رونما ہونے والے تمام چیلنجز کو ہنس کر قبول کرتا ہے یا دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں بہتری محسوس کرتا ہے، بس یہی بی ہیوئیر اس کے ساتھ عمر بھر چلتا ہے اور جو لوگ اسٹریٹنگ ذہن کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنی ڈپریشن کی وجہ خود معلوم کر کے اپنے ہی ماہر نفسیات بن کر علاج کرنے لگتے ہیں کیونکہ نناوے فیصد لوگ پیدائشی نارمل ذہن لے کر اس دنیا میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔“ وہ تفصیلاً گفتگو ایک خاص مقصد کے تحت کر رہی تھی۔

”بھئی تمہیں تو سائیکا ٹرسٹ ہونا چاہیے تھا۔ تمہاری باتوں میں وزن ہے، یعنی ڈپریشن لا علاج بیماری نہیں۔ اس میں خود کو مطمئن و پرسکون رکھنے کی ضرورت ہے۔ سائرہ اب تم نارمل ہو، صحت بھی خوب بنالی ہے تم نے، میرا خیال ہے تم اپلاؤڈ سائیکا لوجی میں ماسٹرز کیوں نہ کر لو پھر بعد میں پی ایچ ڈی۔“ وہ اس کی باتوں سے قدرے مطمئن تھے۔

”دیکھو میں نے تو اپنا دماغ اپنے آباؤ اجداد سے لیا ہے اور تمہارے فیملی سیٹ اپ کے حساب سے دیکھا جائے تو تمہاری قابلیت معجزہ ہے جیسی تو اس سے امپر لیس ہو کر میں نے تمہیں اپنے خاندان کا اہم حصہ بنا ڈالا۔“ ”حسنات مجھے یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ آپ کا نام اور قابلیت اسی شان سے جاری و ساری رہنا چاہیے۔ نام کو ہمیشگی نئی نسل دیتی ہے۔ جس کا آپ نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ دو سال ہونے کو آئے ہیں اب تو آپ اس طرف سوچ سکتے ہیں ناں۔“ وہ بولتے ہوئے بادل ناخواستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

”بھئی یہ فلسفہ مجھے پسند نہیں آیا۔ پرانی، بھسی پٹی خواہشات ہیں سب..... پھر سے تمہیں کچھ ہونے لگا ہے، خدا کے لیے سائرہ، بھول جاؤ اس آرزو کو۔ تم ایک عام عورت نہیں ہو میری جان۔“ وہ ایک دم سے اچھل کر بیٹھ گئے۔ ”تم نے ایک خاص عورت بن کر مجھے اپنے قریب کر لیا ہے، ورنہ میں تمہاری اپنا رملٹی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تم بہت چھوٹی لگنے لگی تھیں۔“

”اپنی زندگی کو اپنے وعدے کے ایفا کرنے سے بدلنے کی کوشش تو کریں۔ آپ کو بہت اچھا لگے گا اولاد

کا بیٹھا ڈالنے..... میں اسی آس و امید میں ہی تو خاص الخاص ہو گئی ہوں، حسنات ہم بہت ڈل ہو گئے ہیں، کچھ گھر میں رونق، گہما گہمی اور شور شرابا ہونا چاہیے جو دل و دماغ کو تروتازہ کر دے گا۔ ذہن کی تمام بند راہیں پھر سے کھل جائیں گی، یہ جمود اور سکوت و یکسانیت ختم ہو جائے گی تو میں خوشی، خوشی اپنی تعلیم بھی پھر سے جاری رکھ سکوں گی۔ آپ بخوبی جانتے تو ہیں کہ تعلیم کے حصول کے لیے پیس آف مائنڈ پہلا فارمولا ہے..... اگر اسے بھلا دیا تو پھر ہم بہت جلد حسرت و یاس میں ڈوبے ہوئے موت کے منتظر پائے جائیں گے اور آپ کی تمام برائیاں اور دولت آپ کی نسل کے بجائے دوسروں کی اولاد کے کام آئے گی۔“ وہ سردیوں کی دہلی ہوئی بارشوں کی طرح رونے لگی۔

آج سائرہ کی زبان سے اپنے عہد کی بازگشت سن کر ششدر ہو کر اسے دیکھنے لگے کہ وہ ان کے وعدے کو بھولی نہیں۔ بیماری کے باوجود یادداشت کمزور نہیں ہوئی۔

”سائرہ بیگم تم جانتی ہو کہ میں پچھلے سال سے دس گنا زیادہ مصروف ہو گیا ہوں۔ اور اب میری مصروفیت میں روز بروز اضافہ ہونے کے امکانات خاصے روشن ہیں۔ سائرہ یہی تو میری کامیابی ہے اور میرے دل کے ارمان پورے ہونے کے دن ہیں۔ تم مجھے ان فضولیات میں الجھانے کی کوشش مت کرو، اچھی فرمانبرداری اور تابعدار بیوی وہ ہوتی ہے جو ہر حال میں شوہر کے ساتھ تعاون کرے اور ایک پیار اور عزت کرنے والا شوہر وہ ہوتا ہے جو بیوی کی خامیوں کو درگزر کر کے اس کے ساتھ نبھا کرنے میں کسی قسم کی جھنجھلاہٹ محسوس نہ کرے۔ میں نے تمہیں کتنی بار ریکورڈنگ کی کہ پی ایچ ڈی کر لو مگر تم نے ہر بار اپنی ہی منطق پیش کر ڈالی۔ میں نے خاموشی اختیار کرنے میں مصلحت جانی۔ اب تم پر یہ فرض لاگو آتا ہے کہ مجھے وعدے یاد دلانے کی کوشش سے باز رہو۔ وعدے اور ضابطے و قانون تو توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ بھول جاؤ سب..... جہاں زندگی کے پانچ سال اس مصیبت و وبال کے بغیر گزر گئے ہیں۔ وہاں چند سال اور سہی، سائرہ بانو اپنی آزاد زندگی انجوائے کرو، خوش رہو اور اپنے شوہر کو بھی خوش رکھو۔ خواہ مخواہ ہی تمہارے دماغ کا کیڑا تمہیں پھر سے اکسانے لگا ہے۔ اپنا اور میرا سکون غارت مت کرو۔ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ میرے پاس بیمار ہونے کا بھی وقت نہیں سوچ لو۔“ وہ مسلسل نان اسٹاپ بولے جا رہے تھے۔

”حسنات اب سن لیں کہ میں آپ کی کھوئی نیت، کچے ارادوں سے بخوبی واقف تھی، آپ نے تو اپنے وعدے کی پاسداری ہی نہ کی مگر میں آپ کے وعدے کی قوت پر ماں بننے والی ہوں۔ یہ مژدہ جانفزا آپ کو سنا کر یاد دہانی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی داد وصول کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے باکی اور تیزی سے بولی تو حسنات حق دق اسے دیکھنے لگے۔ چند ثانیے کمرے میں خاموشی نے ڈیرے جمائے اور پھر ایک طوفان برپا ہو گیا۔

”میری اجازت کے بغیر..... مجھے بتائے بغیر، اتنا بڑا فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اپنی جان کو تم نے پھر سے نئی آزمائش میں ڈال لیا ہے، پچھلا اپی سوڈم بھول گئی ہو؟ تم مرتے، مرتے بچی تھیں، کاش تمہیں میں نے مرنے دیا ہوتا تو آج تم اتنا بڑا دھوکا نہ دے پاتیں۔ خیر اب وہی پروسیجر تو دہرا نا ہی پڑے گا۔“ وہ سخت برہمی سے بولے۔

”آپ کا خیال ہے کہ میں نے شجر ممنوعہ کا پھل تناول کیا ہے اور مجھے جنت سے نکال دیا جائے گا؟ اس دفعہ میں اس ناظم پیریڈ سے بخیر و عافیت نکل چکی ہوں کوئی لیڈی ڈاکٹر اب مجھے ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتی۔ میں نے گستاخی اور غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ فیصلہ خالصتاً خدا کی طرف سے ہے۔ اب اسے نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹنج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بدلوں گی۔“
”میں اسے اپنا بچہ ماننے سے انکار کرتا ہوں۔“ انہوں نے الزام تراشیوں کی انتہا کر دی۔ اشتعال سے آواز اتنی بلند تھی جیسے کمرے کی چھت اڑنے والی ہو۔ ”یہ ہے تمہاری اصلیت۔ بڑی نیک پروین ہونے کا دعویٰ کرتی ہو، سب کو اس اور ڈراما تھا۔“ اسے لگا کمرے میں بادل گر جا اور پھر چند لمحوں بعد بجلی چمکی۔ جس نے آنکھیں چند ہیاد دی ہوں۔

”بی ہیو یور سیلف.....“ سائرہ نے بہ مشکل اٹھ کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔
”شوہر نامدار صاحب، آپ خدا نہیں ہیں۔ آپ لگائیں ایڑی چوٹی کا زور اور کر دیں مجھے آزاد، میں آپ جیسے ناشکرے انسان کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ اب یہ بچہ اس دنیا میں آکر ہی رہے گا۔ اور یہ بچہ آپ کا ہے، اسی وقت اسپتال چلیں، ڈی این اے ٹیسٹ کرواتے ہیں کیونکہ آپ کا یہ شک اور وہم دور ہونا بہت ضروری ہے۔ میں جاہل، بے بس عورت نہیں ہوں کہ اس تہمت کو سینے میں دفن کر دوں گی۔“ حسنا نے اپنے ہونٹ صاف کیے جو غصے میں جھاگ اگل رہے تھے اور پاؤں پیختے ہوئے اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔ غصے اور خفگی میں زبان سے نکلے ہوئے تہمت زدہ کلمات پر ندامت تو نہ ہوئی لیکن سائرہ کے ایک فقرے نے بولتی بند کر دی تھی۔

اگلے دن کی شروعات بے حد بے یقینی اور مایوسی میں ہوئی..... حسنا نے اپنے مابین اس سے فاصلہ قائم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے ملازمین کو جو ہدایات دی تھیں وہ ایسی غیر متوقع تھیں کہ بل بھر کے لیے سائرہ پر بچھتاؤں کی بھرمار ہونے لگی۔ وہ بلکہ، بلکہ کر دہائی دینے لگی۔ حسنا اک چٹان بن چکے تھے۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھر نہ ہلے۔ سائرہ نے توہین و تذلیل کو برداشت کرتے ہوئے ملازمین کے ساتھ مل کر اپنا تمام ذاتی سامان گھر کے عقبی ایک وسیع بیڈروم میں شفٹ کر لیا۔ پروڈم میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ازدواجی زندگی کے محاذ پر اس قدر ناکامی و شکست نے اس کے انگ، انگ کو کھیر کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

چار مہینے سائرہ نے بچے کو خوش آمدید کہنے کی تیاری نہ کر سکی۔ بچے کا کمر اوہی تھا جو ماں کا تھا۔ وہ خوشی، خوشی لاڈ پیار اور چاؤ سے کمرے کو سجا رہی تھی۔ جس کی حسنا کو خبر تک نہیں تھی۔ ان کا آمناسا منابھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ کس حال میں تھی؟ اس کی طبیعت کیسی رہتی تھی۔ انہیں ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سائرہ پر امید تھی کہ بچہ آنے پر حسنا کا تمام غصہ اور ناراضی جھاگ کے مانند بیٹھ جائے گی اور آخر کار یہی بچہ ان کی ازدواجی زندگی کو بحال کر کے مسرتیں اور راحتیں بھر دے گا۔ ڈیوری کے لیے اس کی ماں اور بھابی اسے لینے آئیں تو حسنا نے اپنی ناراضی اور مخالفت کی انہیں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ سائرہ کو خوشی، خوشی ان کے ساتھ رخصت کر کے انہوں نے جو پہلا کام کیا کہ سائرہ کے کمرے سے بچے کی تمام چیزیں اٹھا کر بے دردی سے گیراج میں پھینکوا دیں۔ ان کے سفلے پن اور خبیث بے کی انتہا تھی۔

وہ کتاب پر نظریں جمائے بیٹھے تھے مگر سوچ سائرہ کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ جس میں بھڑکتے شعلوں جیسی تپش اور جلن تھی۔ جو بل بھر کو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ سائرہ نے منہ پر ایسا چائنا مارا تھا کہ ان کی تمام حیات بیدار ہو کر ان پر تازیانے برسا رہی تھیں۔

جاری ہے

رہ گئی اور منہ میں ڈالا چھ نکالنا بھول گئی..... وہ پھرتی سے اٹھی اور آستین سے منہ صاف کرتی پلیٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی حالانکہ پلیٹ وہ ایسی صاف کر دیتی تھی کہ اگر اماں نے گلی کا موڑ مڑتا ریڑھی والا نہ دیکھا ہوتا تو وہ پلیٹ سو گھنٹے پر بھی انہیں خبر نہ ہو پاتی کہ اس میں کیا ڈال کر کھایا گیا ہے۔

”گیٹ کیوں کھول کے بیٹھی ہوئی تھیں تم.....؟“ اگلی پہ چادر لٹکاتے ہوئے اماں نے پوچھا۔

”وہ اماں..... ساجد ابھی ابھی باہر گیا ہے تو وہی کھول کے گیا ہے شاید۔“

”تو تم اٹھ کے بند نہیں کر سکتی تھیں، کوئی زمانہ ہے اس طرح دروازے کھول کے بیٹھ جانے کا اور میں ساجد کو تمہارے پاس بٹھا کے گئی تھی اس کو ایسا کون سا ضروری کام یاد آ گیا کہ میری واپسی کا انتظار بھی نہ کیا اور تمہیں گھر میں اکیلا چھوڑ کے چلا گیا؟“

”ہونہہ.....“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی۔

”مجھے اکیلا تو آپ ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں کوئی ننھی کاکی ہوں۔“

”اور میں نے تمہیں کتنا روکا ہے عظمیٰ کہ اس طرح دروازے پر ریڑھی والوں اور پھیری والوں کو نہ روکا کرو مگر تمہاری عقل میں تو کوئی بات ہی نہیں آتی۔“

”اماں..... وہ وہی بڑے کھانے کو بڑا دل کر رہا تھا..... سچی بڑے مزے کے تھے چٹ پٹے اور خوشبودار.....“ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے چٹارا لیا تو اماں نے ناگواری سے اسے دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

”زبان کا یہ ذرا سا چٹارا عمر کا روگ بن جاتا ہے کبھی کبھی..... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری بھولی، معصوم بیٹی.....“ وہ چادر تان کر وہیں لیٹ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ دروازے کے سامنے کھڑی بڑی دیر تک ریڑھی والے کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا۔ وہ گلی کے کونے سے آتا دکھائی دیا کئی گھروں کے سامنے اس نے ریڑھی روکی جب اس کے دروازے کے سامنے آیا تو وہ اس سے الجھ پڑی۔

”میں نے تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ تم اپنی یہ پھنچر اور منحوس ریڑھی لے کر اس گلی سے نہ گزرا کرو۔ خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو کہ تمہیں سمجھ ہی نہیں آتی میری بات۔ آج کے بعد اس گلی سے اگر گزرے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“

پھر ساری عمر ریڑھی چلانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔“ وہ مسکین صورت بنائے کھڑا تھا اس قدر کھلی دھمکی پر بوکھلا کر رہ گیا پھر پڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”آیا میں غریب، مسکین بندہ ہوں اور آپ کو بھی مجھ سے لگتا ہے خدا واسطے کا بیرہی ہو گیا ہے۔ میرا اور میرے گھر والوں کا رزق اس ریڑھی کے دم سے چل رہا ہے۔ سول کوارٹروں کی ان گلیوں میں میری بکری زیادہ ہوتی ہے تو میں ادھر نکل آتا ہوں۔ اس طرح تو جی ساری باجیاں مجھے اپنے بوسے کے سامنے سے گزرنے سے منع کریں گی اور میں غریب کنگال تو مارا جاؤں گا۔“ رقت زدہ لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

لنڈے کی گھسی ہوئی پتلون اور شرٹ پہننے والا وہ نوجوان یقیناً کسی انتہائی غریب گھر کا لگتا تھا۔ مسکینی، عاجزی اور غریبی اس کے حلیے کے علاوہ لہجے سے بھی نکلتی تھی مگر رابعہ کو اس کی حالت زار کی ذرا پروا نہیں تھی کبھی اکثر اس سے الجھ پڑتی لیکن وہ چپ چاپ ریڑھی گھسیتا آگے چل پڑتا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے بارے میں جواباً کوئی بات کی تھی۔ سامنے والی ریحانہ کو اس پر ترس آ گیا جو ان کی باتیں سن رہی تھی اس کے جانے کے بعد فوراً بولی۔

”وہ ٹھیک کہتا ہے رابعہ..... اس وچارے کے گھر کا چولہا اس ریڑھی کی بدولت ہی چل رہا ہے، باپ کی وفات کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے اس نے۔ بوڑھی اور بیمار ماں سمیت سات بندے اس وہی بڑے کی ریڑھی پر پل رہے ہیں، تم خود سوچو اس کمر توڑ مہنگائی میں کیسے پل رہے ہوں گے۔“

”جیسے دوسرے لوگ پل رہے ہیں، یہاں ہر کوئی بہ مشکل ہی گزارہ کر رہا ہے۔“ رابعہ پر ریحانہ کے بیان کا مطلق اثر نہ ہوا۔ ”بس میں صرف یہ چاہتی ہوں وہ اس گلی سے نہ گزرا کرے۔“

”وہ ٹھیک کہتا ہے تمہیں اس کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں وچارے کی روزی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔“ ریحانہ تاسف سے بولی۔

وہ لب بھینچ گئی، کچھ بھی نہ بولی وہ اس کو کیا بتاتی کہ جب گلی کے کمرے سے وہی بڑے لے لو کی بلند صدا اس کی سماعتوں کو چھوتی ہے تو کیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حلے پیر کی بلی کی طرح وہ فوراً دروازے کی جانب لپکتی ہے اور جلدی سے دروازے کی کنڈی چڑھا دیتی ہے ایسا ہر بار ہی ہوتا ہے جب وہ گلی سے گزرتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی عظمیٰ کو وہی بڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر وہی بڑے کھانے کی فرمائش کرتی لیکن رابعہ اسے اس بری طرح ڈانٹ دیتی کہ وہ سہم جاتی پھر اکثر جب وہ دوپہر کو سونے کے لیے لیٹی یا سوئی دھاگا نکلی، لیس یا دیگر اشیاء لینے قریبی مارکیٹ تک جاتی تو عظمیٰ کو موقع مل جاتا۔ وہی بڑے کھانے کا..... وہ فنانس ساجد کو بازار بھیج کر اپنے لیے وہی بڑے منگوا لیتی یا گلی سے گزرتے ریڑھی والے کو روک کر پلیٹ بھر والیتی اور جلدی سے کھا کر اماں کے آنے سے پہلے پلیٹ دھو کر رکھ دیتی۔ اماں کو نہ

یہ ضروری تو نہیں

جانے کیوں وہی بڑوں سے چڑھتی بلکہ عظمیٰ کو تو یہ لگتا کہ اماں کو اس کی ہر بات سے خواہ مخواہ کی ضد ہے۔

”تم دروازے میں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟“

اچانک اماں کی آنکھ نیند سے کھلی تھی اور دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہونے پر وہ ننگے پاؤں بھاگی چلی آئی تھیں۔ عظمیٰ دروازہ بند کر کے پلٹی۔

”کہاں گئی تھیں تم؟“ ان کے تیور غضبناک ہوئے۔

”کہیں بھی نہیں اماں۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر اندر کی جانب بڑھی تو اماں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”تو پھر دروازے پر کیا کر رہی تھیں تم.....؟“

”اماں ساجد ابھی باہر نکلا ہے تو میں نے پیچھے سے دروازہ بند کیا ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو کر وضاحت دینے لگی۔ اماں نے اس کی کلائی تو چھوڑ دی لیکن مشکوک نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اندر کمرے میں چلی گئی۔

اس کی اماں سخت مزاج اور جھگڑا نہیں تھیں۔ بس کبھی کبھار بے جا سختی کر جاتیں وہ بھی صرف عظمیٰ کے ساتھ..... ساجد کے ساتھ ان کا رویہ محبت سے لبریز ہوتا۔

اماں نے اس پر پابندیوں کے انبار لگائے ہوئے تھے۔ کسی سہیلی کے گھر جانے پر بھی پابندی تھی۔ حتیٰ کہ دروازے سے باہر جھانکنے تک پر پابندی تھی اور چھت پر جانے کی تو سخت ممانعت تھی۔ کوئی دور، قریب کا رشتے دار بھی نہ تھا، نہ محلے کے کسی گھر میں آنا جانا۔ کبھی کبھی اس چھوٹے سے گھر میں اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ رو پڑتی۔ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کے علاوہ اماں کے اس سوتیلے رویے پر..... اماں نے اسے قید سا کے رکھ دیا تھا صرف دو وقت کی روٹی اور عید پر عید پر نیا جوڑا..... کیا صرف یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی ضرورتیں..... اتنی محدود زندگی، اتنی تھوڑی

یہ ضروری تو نہیں

رکھے، کوئی راز نہ چھپائے اور.....“ اماں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ ”اور مجھے دیکھو میں کیسی بد نصیب بیٹی تھی اور کیسی بے وفا سیلی تھی اپنی اماں کی..... کہ ہر بات چھپائی ان سے، دل کے سارے راز پوشیدہ رکھے، ہوا نہ لگنے دی ان کو..... پھر بے وفائی کی سزا تو ملتی تھی ناں، ماں سے بے وفائی کی سزا۔“

☆☆☆

وہ اپنی کہانی کا ایک، ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ زخموں سے چور چور کھرٹے سے بے نیاز لفظ، وہ مالی کی بیٹی تھی۔ ابا کوٹھیوں اور بنگلوں میں پکا ملازم تھا ہاتھ میں صفائی اور نیک نیتی نے عزت کی چادر دے رکھی تھی۔ راجہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی، ابا سر شام گھر لوٹتا تو اس کے لیے پھولوں کا گلدستہ لاتا جسے وہ اپنے سر ہانے رکھ کر سویا کرتی اور رات بھر خوشبوؤں کے حصار میں رہتی۔ وہ سب کی لاڈلی تھی بھائیوں کی، بہنوں کی، ابا کی، اماں کی..... بھائی اسکول سے واپسی پر اپنے، اپنے بستوں میں اس کے لیے ٹافیاں لانا نہ بھولتے، ابا پھولوں کے گلہستے کے ساتھ مٹھائی کا لفافہ لاتا جو سب میں برابر تقسیم ہوتی تو بہنیں اپنے حصے کا ادھا اس کی مٹھی میں دبا دیتیں۔ اماں کی تو وہ سہیلی تھی۔ ”میری رابی تو میری پکی سہیلی ہے۔“ ماں کوئی لمحہ اس کے بغیر نہ رہ پاتی۔

پھر اس کو دہی بڑے کھانے کا چمکا لگ گیا۔ اب ابا بلاناغہ اس کے لیے دہی بڑے لانے لگے، سی، سی کرتے ہوئے وہ دہی بڑے کی پلیٹ چٹ کر جاتی، آنکھوں سے ٹاک سے پانی بہتا رہتا، وہ اور مرچیں ڈال کر مزید چٹ پٹے بنا لیتی اور سوں، سوں کرتی کھاتی رہتی۔ اسے مزید کی طلب رہتی۔ حالانکہ ماں اس کی صحت کے خیال سے منع بھی کرتی مگر جب گلی کے کٹڑ پر ریڑھی والے کی مخصوص صدا ابھرتی تو وہ بھاگتی دوڑتی مٹھی میں نوٹ دبائے

کی تو میں تمہاری زبان بھیج لوں گی۔“ وہ سرخ ہوتے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اندر جاتی اماں کو دیکھتی رہی اور آنکھوں سے ٹکٹا گرم پانی اس کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا گود میں گرتا رہا۔

☆☆☆

کالے سیاہ اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا، آسمان پر آخری تاریخوں کا مدھم چاند تھا۔ جو سیاہ رات کے آخری پہر کی تاریکی کو پوری طرح منور کرنے سے قاصر تھا اور تھکے، تھکے ماند پڑتے ٹٹماتے ستارے بھی رات سے جدائی پر اداس تھے۔

پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ وہ اگر پوری رات نہیں سو پائی تھی تو اس کی چار پائی کے ساتھ چار پائی جوڑ کے لیٹی اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ جاگتی تھی۔

کچھ راتیں کتنی دکھ بھری اور طویل ہوتی ہیں کہ سویر کا انتظار کرتے، کرتے آنکھیں تھکنے لگتی ہیں۔ کیسی انکشاف بھری رات تھی اماں نے کوئی راز نہیں رکھا تھا کوئی بات بھی نہیں چھپائی تھی۔ پوری کہانی حرف، حرف سنائی دی تھی اسے، محبت کی اولین ساعتوں سے لے کر وچھوڑے کے کرب تک ہر بات لفظ بہ لفظ تکلیف دہ، ورق، ورق، ورق اذیت سے پُر۔

آج اس پر راز کھلا تھا کہ اماں کے وہم، خدشے، خوف، اندیشے اور وسوسے بے بنیاد نہ تھے ان کے پس منظر کوئی کہانی تھی۔ جسے سن کر عظمیٰ بلک، بلک کر روئی اور اپنے دل پر جی سالوں کی گرد دھو ڈالی۔ وہ ہر وقت اماں سے شاکر رہا کرتی تھی وہ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔

”عظمیٰ..... میری اماں کہا کرتی تھی کہ ماں بیٹی آپس میں سہیلیاں ہوتی ہیں اور سہیلیوں کے درمیان کوئی راز داری نہیں ہوتی اور بیٹی کو چاہیے کہ اپنی ہر بات ماں سے کہہ دے، کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں

زخمی کر لیتا۔ اسے اپنا آپ اس طوطے کی طرح لگتا۔ مجبور بے بس قیدی..... اوپر سے اس کے بدن کے آر پار ہونٹیں اماں کی شک بھری نگاہیں۔ ”کیا اماں کو مجھ پر ذرا بھی بھروسہ نہیں ہے؟“ وہ سوچتی رہتی اور کڑھتی رہتی۔

بالخصوص کوئی ریڑھی والا صدا لگا کے جب گلی سے گزر رہا ہوتا تو اماں کو کوئی غیر محسوس بے چینی سی لگ جاتی۔ وہ جلدی سے گلی کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کی کنڈی لگا دیتیں اور پہلے سے بند دروازے کو اچھی طرح چیک کرتیں۔ عظمیٰ کن آنکھوں سے ان کی ایک ایک حرکت بغور دیکھتی۔ ایک دن وہ اماں سے پوچھ بیٹھی۔

”کیا ہے اماں..... کیوں کرتی ہیں آپ اس طرح، کون سا وہم ہے جو آپ کے دل کو دہلائے رکھتا ہے؟ ایسی کون سی بے اعتباری ہے، میری ذات پر جو آپ کی نظر میں مجھے سرخرو نہیں ہونے دیتی۔ میں نے بھی آپ کا بھروسہ، آپ کا مان، آپ کا اعتبار توڑنے کی کوشش کی ہے؟ پھر آپ مجھ پر اتنی بے اعتباری کیوں کرتی ہیں؟ اتنے پہرے کیوں بٹھا رکھے ہیں؟ میں تو اماں سانس بھی آپ سے پوچھ کر لیتی ہوں۔ آپ کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا..... پھر آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں چھت پر اگر جاؤں گی تو باہر چھلانگ لگا دوں گی..... دروازہ اگر کھولوں گی تو کسی کے ساتھ بھاگ جاؤں گی اور اگر کوئی اور نہ ملا تو اس دہی بڑے بیچنے والے کے ساتھ فرار ہو جاؤں گی، اس کی ریڑھی کا ڈنڈا تھام کر.....“ وہ جو اماں کی ہتھیلیوں پر سر رکھ کے زار زار روتے ہوئے اماں کے نامناسب رویے کی وجہ پوچھ رہی تھی تڑپ اٹھی جب اماں نے ایک جھٹکے سے اس کا سراپے ہاتھوں سے اٹھایا اور کھینچ کے اس کے چہرے پر پھینک دیا۔

”اگر آج کے بعد تم نے اس طرح کی بکواس

ضرورتیں، وہ دل ہی دل میں اماں سے شاکر ہوتی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اماں نے آٹھویں جماعت سے ہی اٹھالیا۔ وہ بہت روئی، منتیں کیے لیکن اماں نہ مان کے دیں۔ اس کی سہیلیاں اب میٹرک کے بعد کالج میں جاتی تھیں اور وہ زنگ آلود ٹریک کی طرح گھر کے کونے میں ڈال دی گئی۔

شاید ابازندہ ہوتے تو حالات مختلف ہوتے۔ ابا کی بہت دھندلی، غیر واضح سی شبیہ اس کے ذہن کے پردے پر ثبت تھی۔

اس کے برعکس ساجد پڑھائی میں نالائق اور نکما تھا مگر اماں اسے بہت سا پڑھانا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ بہ مشکل میٹرک تک ہی جاسکا تھا، یوں اماں کے خواب ادھورے رہ گئے جن کا انہیں بہت قلق تھا اور وہ جو پڑھائی میں لائق فائق تھی مزید پڑھنے کی خواہش مند تھی۔ اس کے خوابوں پر اماں نے سختی سے پاؤں رکھ دیا اور اسے گھر کے کونے میں ڈال دیا۔ اوپر سے اماں کی شک بھری بے اعتباری نظریں جو ہر وقت اس کا بدن چھیدتی تھیں۔ اس کا دل لہو لہو کرتی تھیں۔ وہ میٹرہیوں کے پاس سے گزرتی تو اماں کی سخت آواز اس کے قدموں کو زنجیر کرتی۔

”چھت یہ کیوں جا رہی ہو..... چھت پر گئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔“

وہ وہیں بہسنی میڑھی پر بیٹھ کر اپنا جرم سوچنے لگتی۔ وہ بند دروازے کے آس پاس پھرتی تو عقب سے اماں پکارتیں۔

”عظمیٰ کہاں جا رہی ہو؟ دروازے کے پاس کیا کام ہے؟“

اس کی آنکھیں پانی، پانی ہو جاتیں اور وہ پلیٹ کر پنجرے میں بند ساجد کے طوطے کے پاس بیٹھ جاتی جو باہر نکلنے کے لیے چاروں کونوں میں پھیریاں لگاتا، پنجرے کے تاروں کو چونچ مار کر اپنی ہی چونچ

یہ ضروری تو ہیں

مار..... دو اس سے بڑی بہنیں، دو بڑے بھائی، چھوٹا سا گھر بھرا تھا بن بیا ہے لوگوں سے..... پھر وہ کیسے بیاہ دی جاتی..... یہ سوچ تو اسے آئی ہی نہیں تھی اب اماں نے اچھی طرح سمجھا تو دی مگر سمجھ بوجھ کہاں تھی ان دنوں۔

”میری اماں کسی صورت بھی نہیں مان رہیں تمہارے گھر رشتہ لانے کے لیے۔“ ادھر سے ارشد پریشان سا اس کے سامنے آیا اور درمیں اضافہ ہی کیا۔ ”یہاں کون سا تمہارا رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔“ اس نے پورا دکھ بیان کیا۔

”اب کیا ہوگا ارشد.....؟“ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی ارشد۔“ اس نے سچی بات بتائی۔

”ہوں.....“ ارشد کے ماتھے پر کسی گہری سوچ کی لکیر ابھری۔

پھر..... اندھی عمر کا اندھا فیصلہ کرتے ہوئے وہ ذرا نہ ڈمگائی، اس کا دل ذرا نہ کانپا، اپنے جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑتے ہوئے، اپنے باپ کی عزت کو قدموں تلے روندتے ہوئے۔ اپنی ماں کے اعتبار کو تار، تار کرتے ہوئے..... اپنے گھر کو اپنی جنت کو چھوڑتے ہوئے اور لڑکیاں جب جان بوجھ کر اپنی جنت کو چھوڑ دیتی ہیں تو سیدھی دوزخ میں جا گرتی ہیں۔

گھروں سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کو کیا ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ماں، باپ کا خیال نہیں آتا کیا.....؟ زبان کی نوک پر وہی بڑوں کا محسوس کیے جانے والا صرف چند لمحوں کا چٹ پٹا سا ذائقہ اس سے اتنا بڑا فیصلہ کرا گیا کہ وہ راتوں رات گھر سے بھاگ گئی..... اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس کی ماں کیسے، کیسے بین کر رہی ہے، اس کی بہنیں ایسے روئیں جیسے کوئی کسی کے مرنے پر روتا ہے، اس کا

گما..... اماں اس کی نظریں اتارتیں اور شہزادہ تو آ گیا تھا خود چل کر، اس نے اپنے سامنے کھڑے پتلے اور لمبے سے ارشد کو نظر بھر کر دیکھا اور نہیں تو کیا..... اور پھر شہزادہ تو وہی ہوتا ہے جس کو دل راضی خوشی اپنی سلطنت پر بٹھا دے اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ جائے اور رابعہ اس کے قدموں میں ہی بیٹھی تھی جب اس نے کہا تھا۔

”میں تو غریب سا بندہ ہوں رابی۔“
”میں تو جیسے کوئی امیر زادی ہوں ناں۔“ وہ ہنس دی، تحقیر زدہ ہنسی۔

”میرا بہت چھوٹا سا گھر ہے۔“ اس نے اگلی سچائی اگلی۔

”میرا بنگلا بھی تم نے دیکھ رکھا ہے؟“ وہ ایک بار پھر یونہی ہنس دی، بلا جواز، بلا ضرورت کہ ان دنوں ہنسی یوں ہی بلا ضرورت آتی تھی۔

”پھر بھی رابعہ.....“ اس کے دل میں جانے کتنے وہم تھے مگر رابعہ بے پروائی سے اس کی سوچوں کو رفع کرتی گئی۔

”کچھ نہیں، تم دل میں کوئی وہم نہ پالو، جب میں خوش ہوں، مطمئن ہوں، مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیے، باقی دنیا کی کوئی چیز نہیں۔“

کیسی سخاوت ہوئی ہے محبت کے مزاج میں کہ دنیا کی ہر شے کو ٹھکرا دو..... بس محبت کے لیے.....

محبت کی اندھی پگڈنڈی پہ وہ آنکھیں بند کیے چلے جا رہی تھی جب اسے کسی سوچ کی ٹھوکر لگی۔ ”کیا اماں، اباماں جائیں گے؟“

”پہلے میری کوئی بات سمجھنا ہی ہے؟“ دل اٹھلایا۔

لیکن یہ خام خیالی ثابت ہوئی ابا کو خبر ہونے سے پہلے ہی اماں نے اسے مار مار کر نیل و نیل کر دیا تھا۔ اسے درد سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اماں نے جو کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا اب اتنی

کفارہ ادا کرتے، کرتے عمر کی نقدی ختم ہو جاتی ہے لیکن سود پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ رابی کی الہڑ آنکھوں میں پہلا پہلا خواب کیا اترا کہ بدن میں سے چیخیاں بھر گئیں، زبان کا چٹخا رادل پر چٹکی لگا گیا، گلی کے کٹر پر وہی بڑے والے کی مخصوص باجے کی آواز ”پاں“ ہوئی تو وہ ہر کام بھول کر گلی کی طرف لپکتی، ہر کام سے ضروری یہی لگتا، چٹ پٹا سا ذائقہ پورے بدن میں سرور سا بھر دیتا۔ وہی بڑوں سے لبالب پلیٹ پکڑتے ہوئے ہاتھ پکڑانے والے ہاتھ کے ساتھ ذرا کا ذرا مس ہوتا تو اس کے جسم میں جیسے مرچیں سی لگ جاتیں۔ کانپتے ہوئے، لرزتی پللیں، نئی، نئی آئی جوانی کے تمام لوازمات..... کوئی انوکھا اور کرار سا ذائقہ تھا ہر گھڑی اور ہر بل میں، ریڑھی والے ارشد کی نظر بھی اپنے کام سے ہٹ کر اس گھڑی، گھڑی دروازے سے باہر جھانکتی لڑکی پر ٹھہر گئی تھی ایسی من موئی صورت کہ وہ کاروباری حساب کتاب بھول جاتا۔

”وہی بڑے کی ایک پلیٹ لبالب۔“
”پیسے کتنے؟“ بندھتی تھکتی۔

”رہنے دیں، آپ سے پیسے کیا لینے۔“ آنکھیں اس کا سراپا ٹٹولتے ٹٹولتے نکلتیں۔

”ہائے اللہ.....!“ اس کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ تو بے ایسا سخی اور پھر طرزِ خطاب کتنا خوب صورت۔ وہ سپنوں کے کسی جہان میں کھونے لگتی۔

ریڑھی کے ہینڈل پر اس کے لائبرائی انگلیوں والے مضبوط ہاتھوں کو دیکھتی تو اسے دنیا کا عظیم ترین کام یہی لگتا۔ وہی بڑوں کی ریڑھی کو گلی، گلی گھینٹا، بڑی آپا کو اماں کا دیا جانے والا مشورہ اسے سچ ہوتا دکھائی دیتا۔

”اماں اس کے لیے کوئی وہی بڑے بیچنے والا برڈھوٹا۔“ اور جواباً اماں نے کہا تھا۔

”میری دھی رابی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے

دروازے سے باہر لمبی چوٹی کمر پر لہراتی جاتی۔
”کبھی کبھار کی بات اور ہوتی ہے رابی..... ہر روز وہی بڑے نہ کھایا کر، یہ مسالے صحت کے لیے اچھے نہیں ہوتے، معدے میں جلن ہو جاتی ہے۔“

اماں اس کی صحت کے لیے فکر مند ہوتی۔
”کوئی نہیں۔“ وہ بے پروائی سے کہتی۔ ”اماں

تجھے پتا ہے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ وہی بڑے پسند ہیں۔ میرا دل کرتا ہے، وہی بڑوں کا بڑا سا دیکھا ہو لبالب..... اور میں پیالے میں ڈالتی جاؤں کھاتی جاؤں..... ہائے مزہ آجائے قسم سے۔“ اس نے

زور دار چٹخا رالیا۔ اماں سمیت دونوں، بہنیں بھی اس کے بیچنے پر ہنس دیں۔

”اماں..... میرا مشورہ ہے کہ اس کے لیے کوئی وہی بڑوں کی ریڑھی لگانے والا ہی ڈھونڈنا

تا کہ وہی بڑوں کا شوق تو پورا ہو اس کا، ڈالتی جائے کھاتی جائے..... رنج کے کھالینا وہی بڑے۔“ آپا

کی ان دنوں نئی، نئی منگنی ہوئی تھی اماں کو اس کے حوالے سے آپا نے مشورہ دیا۔

”ہائے نی، کیوں خیری صلا..... میری دھی رابی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔“ اماں دلار سے بولی اور یہی وہ لمحہ تھا، ظالم اور قاتل لمحہ.....

جب آپا کی مذاق میں کہی ہوئی بات اندر کہیں دل کے کسی خانے میں ترازو ہو گئی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

وہ کچی پکی عمر کے کچے پکے بل تھے اور آتی جوانی کی نادان رتیں۔ بوڑھی دادی کہا کرتی تھیں کہ یہ اندھی عمر ہوتی ہے قدموں کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیتی ہے پھر برگ کچھ بھی نہیں کر پاتے، ٹھوکر کھائے بغیر نہیں رہ سکتے اور آدمی کو کیا خبر ہوتی ہے کہ ایک بار جو ٹھوکر لگی تو زندگی پھر ٹھوکروں کی زد میں آ جاتی ہے۔

دادی یقیناً ٹھیک ہی کہتی تھیں..... کچھ غلطیوں کا

172 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پہچان کر خطرے کی بو پالتی ہیں۔ گھر میں بیٹیاں جوان ہوں تو مائیں سونا بھول جاتی ہیں، وہ کسی ماں تھی.....! اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

”شاید میری ماں کو مجھ پر بھروسہ تھا کہ وہ غافل ہوگئی..... اور میں نے اس کے بھروسے کو، مان کو، اعتبار کو راتوں رات مٹی میں ملا دیا۔“ کوئی گلیشٹر تھا جو پکھلا تو آنکھوں کو پانی، پانی کر گیا۔

”میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بیٹیاں تو مان ہوتی ہیں، بھرم ہوتی ہیں، عزت و آبرو ہوتی ہیں، رشتوں کا، نسلوں کا، خاندانوں کا..... اور بیٹیوں پر تو بڑی بھاری ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ یہ بھرم نہ توڑیں۔ میری ماں سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ محبت کے ساتھ مجھ پر اعتبار کرتی رہی مگر رکھوالی کرنا بھول گئی۔ اگر غلطی میری ماں سے ہوئی تھی تو صبح میں بھی نہیں کر رہی، ورنہ میری بیٹی مجھ سے اس طرح شاکہ نہ رہتی۔ میں رکھوالی تو کر رہی ہوں مگر بے اعتباری کے ساتھ..... اس طرح تو میں انجانے میں اسے بغاوت کی راہ دکھا رہی ہوں..... میری بیٹی کہتی ہے کہ اماں مجھ پر اعتبار کر کے دیکھو تو.....“ اس نے آسمان کے کناروں سے پھوٹی صبح کی سفیدی کو دیکھا مقدس اور پاکیزہ..... اندھیرے کا نام و نشان بھی نہیں تھا، ایک نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔

آنسو صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک نئے عزم کے ساتھ..... اللہ سے استقامت مانگتے ہوئے وہ پرسکون تھی۔ اسے اپنی بیٹی کی سہیلی بننا تھا اور نگران بھی..... اور اسے یقین کامل تھا کہ اس کی بیٹی اس کا مان نہیں توڑے گی..... یہ ضروری تو نہیں کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوں۔ اس نے اٹھ کر پرانے بکسے کا ڈھکن کھولا جس میں عظمیٰ کی کتابیں رکھی تھیں جن پر اب سورج کی پہلی کرن پڑ رہی تھی گویا روشنی دور نہیں تھی۔



فیکٹری میں ملازمت کرنے لگی۔ چنانچہ گھر کا چولہا ٹھنڈا ہونے سے محفوظ رہا۔ اس کی ساس جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہار نہ سکی اور چند ماہ کے اندر ہی..... چٹ پٹ ہو گئی۔

جن لوگوں کا جینا دوسروں کے لیے اذیت کا باعث ہوتا ہے، ان کے مرجانے سے زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ساجد کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا تھا مگر ساجد بھی ارشد کا بیٹا تھا۔ یہ مشکل میٹرک تک گیا اور میٹرک میں بری طرح فیل ہونے کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ اُسے درکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بھیجے لگی کہ فارغ رہ کر کسی غلط صحبت میں نہ پڑ جائے۔ عظمیٰ اگرچہ پڑھائی میں لائق تھی اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا لیکن مڈل کے بعد البعہ نے اسے مزید پڑھنے سے روک دیا۔ اور خود فیکٹری کی نوکری چھوڑ کر گھر میں ہی سلائی کا کام کرنے لگی..... اور اب سارا دن بیٹی کی نگرانی میں گزار دیتی، اس کے بل، بل کی خبر گیری کرتی، لمحے، لمحے کا حساب مانگتی..... وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے ذرا سی چوک ہو اور اس کی بیٹی چور رستے تلاش کر کے ان راہوں کی مسافر بنے جن..... پر چل کر اس نے اپنے قدم آبلہ پا کیے تھے۔

لیکن آج اس کی بیٹی نے اسے کیسا آئینہ دکھایا تھا کہ وہ گہرے صدمے میں تھی۔ اس کی بیٹی نے ٹھیک سمجھا تھا، واقعی یہ خوف اس کے دل کے ساتھ کسی..... منزل کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ وہ اگر ذرا سی بھی چوک گئی تو اس کی بیٹی گھر کی دہلیز پار کر جائے گی..... وہ اس کی رکھوالی کر رہی تھی کیونکہ اسے اپنی ماں سے ہمیشہ یہی شکوہ رہا کہ ماں نے اس کی اچھی طرح رکھوالی نہیں کی..... ایک ماں ہونے کے ناتے اسے پتا ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بیٹی غلط رستوں پر چل نکلی ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کے چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ

اپنے محبوب کو دیکھ جاتی۔

دیواروں میں چنے، مٹے سال صدیاں ہو کر گزرنے لگے، پہلے ساجد زندگی میں آیا پھر عظمیٰ چلی آئی، ٹھیک کہتے ہیں لوگ بچے جینے کا سہارا ہوتے ہیں وہ بھی دونوں بچوں کی آس میں جینے لگی۔

ایک دن نہ جانے اس کے جی میں کیا سائے وہ ان جانی پہچانی گلیوں میں چلی آئی جہاں ابا کی انگلی پکڑ کر کتنی بے فکری سے گھوما کرتی تھی، بچپن سے لڑکپن اور جوانی تو ابھی آدھی پونی ہی آئی تھی کہ اس نے وہ گماں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس لمحے اس کا دل دھڑاڑ مار مار کر دیا جب خبر ملی کہ وہ لوگ تو بڑا عرصہ ہو گیا نہ یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ ابا کو کتنی محبت تھی اس محلے سے، اس گھر سے جس کی ایک، ایک اینٹ میں گارے کی جگہ ابا کا پسینہ لگا تھا۔

کیا بیٹیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ والدین کو زمانے بھر میں رسوا کر کے در بدر کر دیں.....؟ اور شاید اسی خوف کے پیش نظر لوگ بیٹیوں کی پیدائش پہ دھاڑیں مار کے روتے ہیں۔

”کاش! میں پیدا ہوتے ہی مرجاتی۔“ اس کا دل اپنے ہی لبوں میں ڈوبا، وہ دیر تک روتی رہی جیسے کوئی کسی کے مرجانے پر روتا ہے، اتنا تو وہ پھر زندگی بھر نہیں روتی تھی ارشد کے ایک سیڈنٹ کے بعد دس دن کو مائیں رہنے کے بعد مرجانے پر بھی نہیں..... بس وہ آنسوؤں سے بے نیاز خشک آنکھوں سے کورے کفن میں لپٹے اس شخص کو دیکھتی رہی جس کے پیچھے، پیچھے چلتے، چلتے وہ اپنی جنت چھوڑ آئی تھی۔ جس کے لیے اس نے خود سے وابستہ اپنے پیاروں کو کھویا تھا اور خود کو بے سکون کر لیا تھا ہمیشہ کے لیے..... ماں، باپ کو دکھ دے کر کون سکون سے رہا ہے بھلا.....؟

ارشد کی موت کے بعد وہ ایک کپڑے کی

مختی اور ایماندار باپ اپنی غلطیاں اپنے گناہ شمار کرتا رہا..... اور اس کے بھائی بے غیرتی کی چادر تان گئے۔ جو لڑکیاں، ماں، باپ کی عزت و آبرو کو رات کی تاریکی میں رول کے گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں ان کو پھر زندگی میں کہیں عزت نہیں ملتی۔ ارشد کی ماں نے اسے بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں بہویں نہیں ہوتیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسے بددعا میں دیتی..... اور بددعاؤں کی بنیاد پر بننے والے گھر تو نمک کے مکان ہوتے ہیں۔ قطرہ، قطرہ آنسو سے ٹوٹ جانے والے، اس نے جان لڑادی، گھر نہ ٹوٹے کہ اپنے پیچھے تو وہ اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کر آئی تھی۔

ساس کی نگاہ میں وہ کھٹکتی رہتی۔ اس کا ہر عمل ناقابل قبول ہوتا، اسے ہر، ہر جگہ پر گھر سے بھاگی ہوئی، بے حیا لڑکی کا طعنہ ملتا، وہ کان لپیٹ لیتی، ہونٹ سی لیتی..... دل روتا رہتا، بدن دکھتا رہتا، جب ارشد ذرا، ذرا سی بات پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ نیل و نیل بدن پر نکوریں کرتی رہتی۔ اس کے کہیں بھی آنے جانے پر پابندی تھی، بننے سنورنے کی ممانعت تھی، اس کی محبت نے تو بدلے میں گویا اسے عمر قید با مشقت سنا دی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا، کوئی تھکن سی پورے بدن میں پھیلتی پوروں کو چھونے لگتی۔ وہ چھت پر دو گھڑی کے لیے کھلی ہوا میں سانس لینے جاتی تو ارشد کی دھاڑا سے سہا دیتی۔ ”چھت پر کسے دیکھنے جاتی ہو تم روز روز..... کوئی اور ریڑھی والا پھانسنے کا ارادہ ہے، وہی بڑوں سے اور وہی بڑے بیچنے والے سے دل بھر گیا ہے کیا.....؟“ وہ چوٹی سے پکڑ لیتا اور بڑی زور کی مار مارتا۔ وہ بے اعتبار عورت تھی پھر وہ اعتبار کیسے کرتا بھلا.....!

وہ چپ چاپ ویران و بیابان آنکھوں سے